ماہنامہ منادی نئی دِلّی (خواجہ نمبر)

جلد اوّل

سوانح عمری

امام المشائخ، شمس العلماء، مصوّر فطرت

حضرت خواجہ سیّد حسن نظامی دہلوی رحؒ

نوشتہ

ملا واحدی صاحب دہلوی، دہلوی

ایڈیٹر

حسن ثانی نظامی مدیر منادی، دہلی

درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی

۸/۱۴ جیکب لائنز کراچی - درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ دہلی

اشاعت اوّل

دسمبر ۱۹۵۷ء

جماد اوّل ۱۳۷۷ھ

قیمت

لائبریری ایڈیشن :- چھ روپے

قسم اوّل :- ساڑھے تین روپے

قسم دوم :- ڈھائی روپے
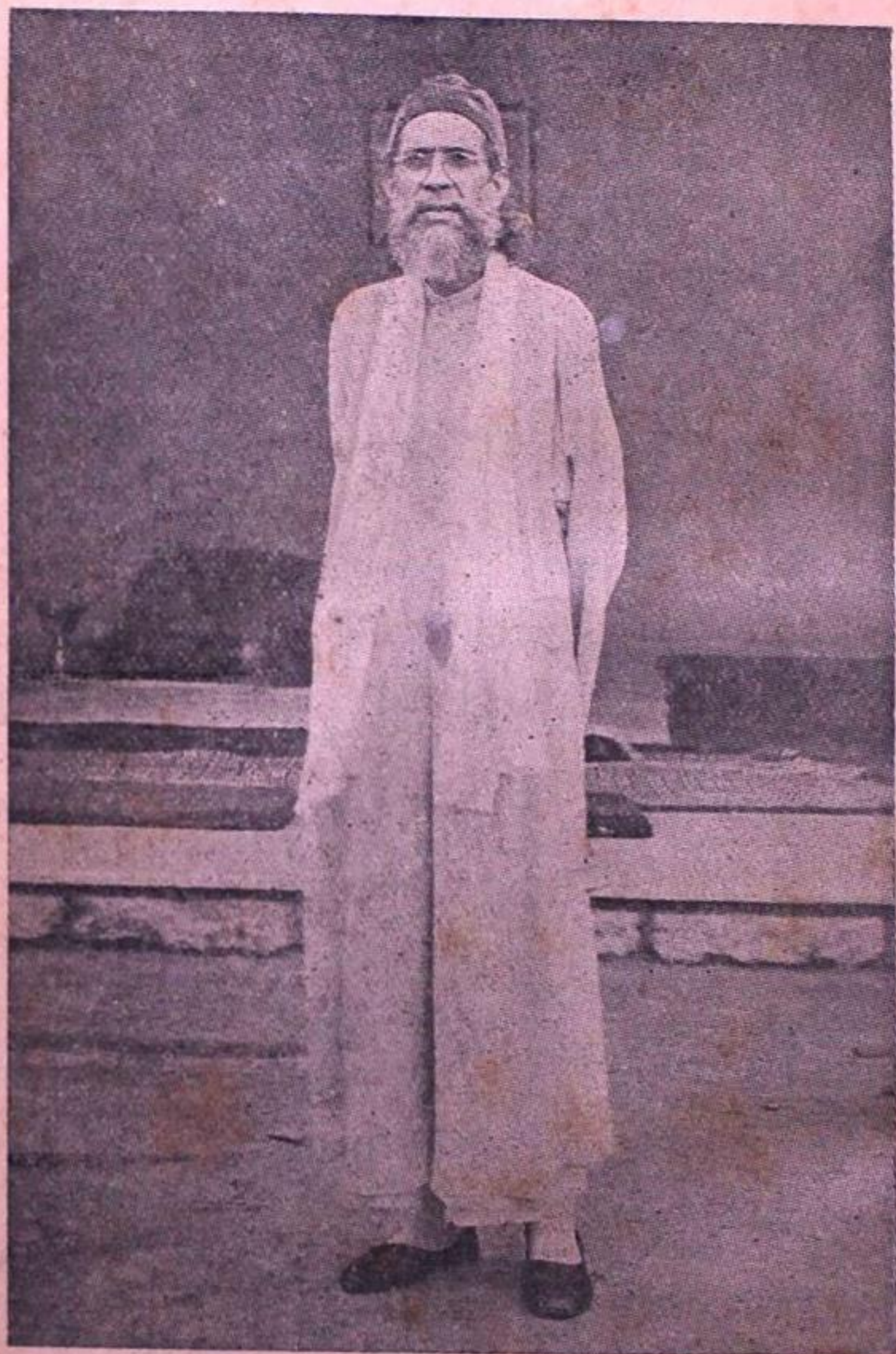
حضرت خواجہ حسن نظامی
(تصویر سنہ ۱۹۴۷ء)

مؤلف سوانح عمری
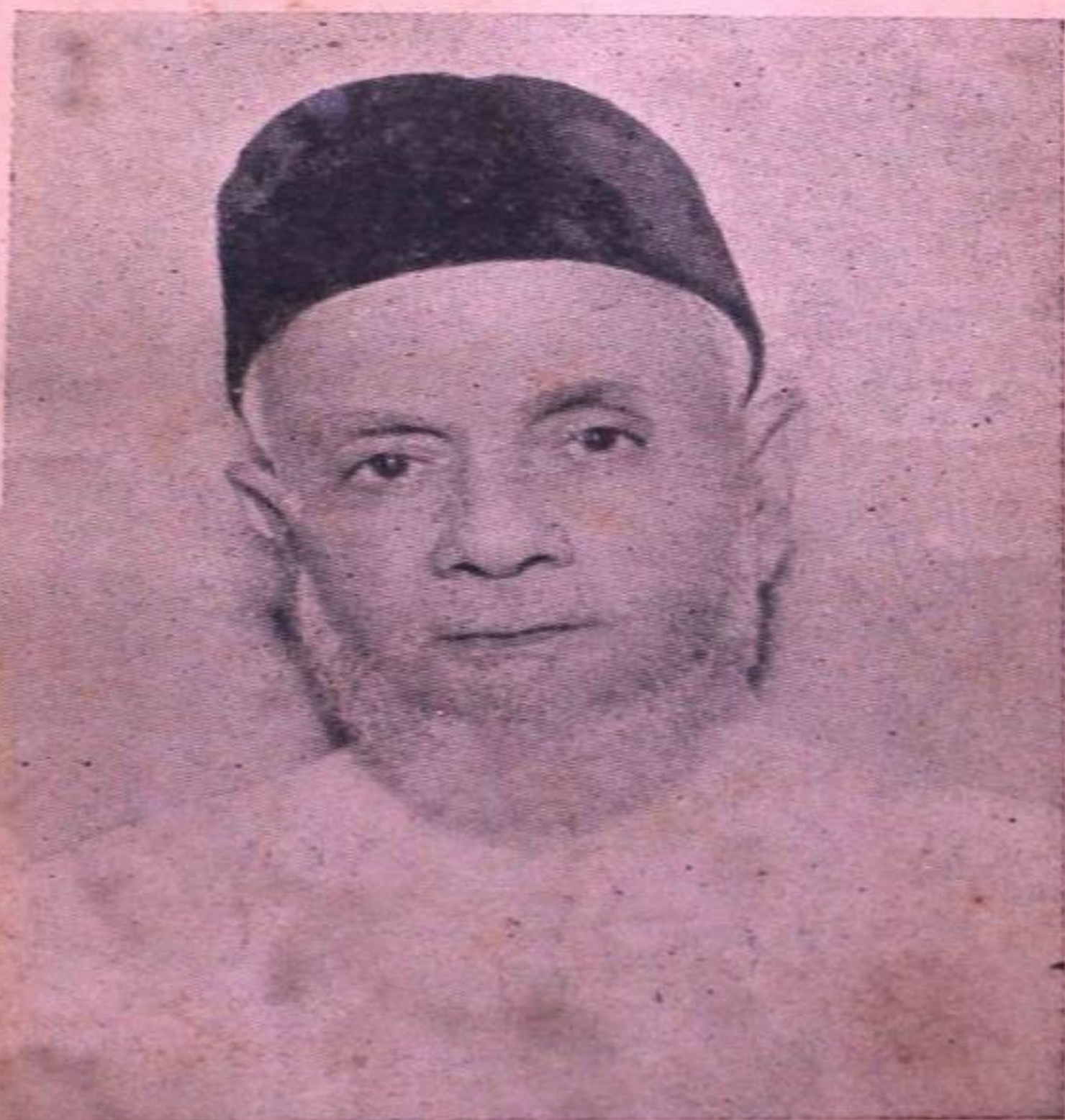
ملا واحدی صاحب دہلوی
(۱۹۵۲ء)

حضرت خواجہ صاحب
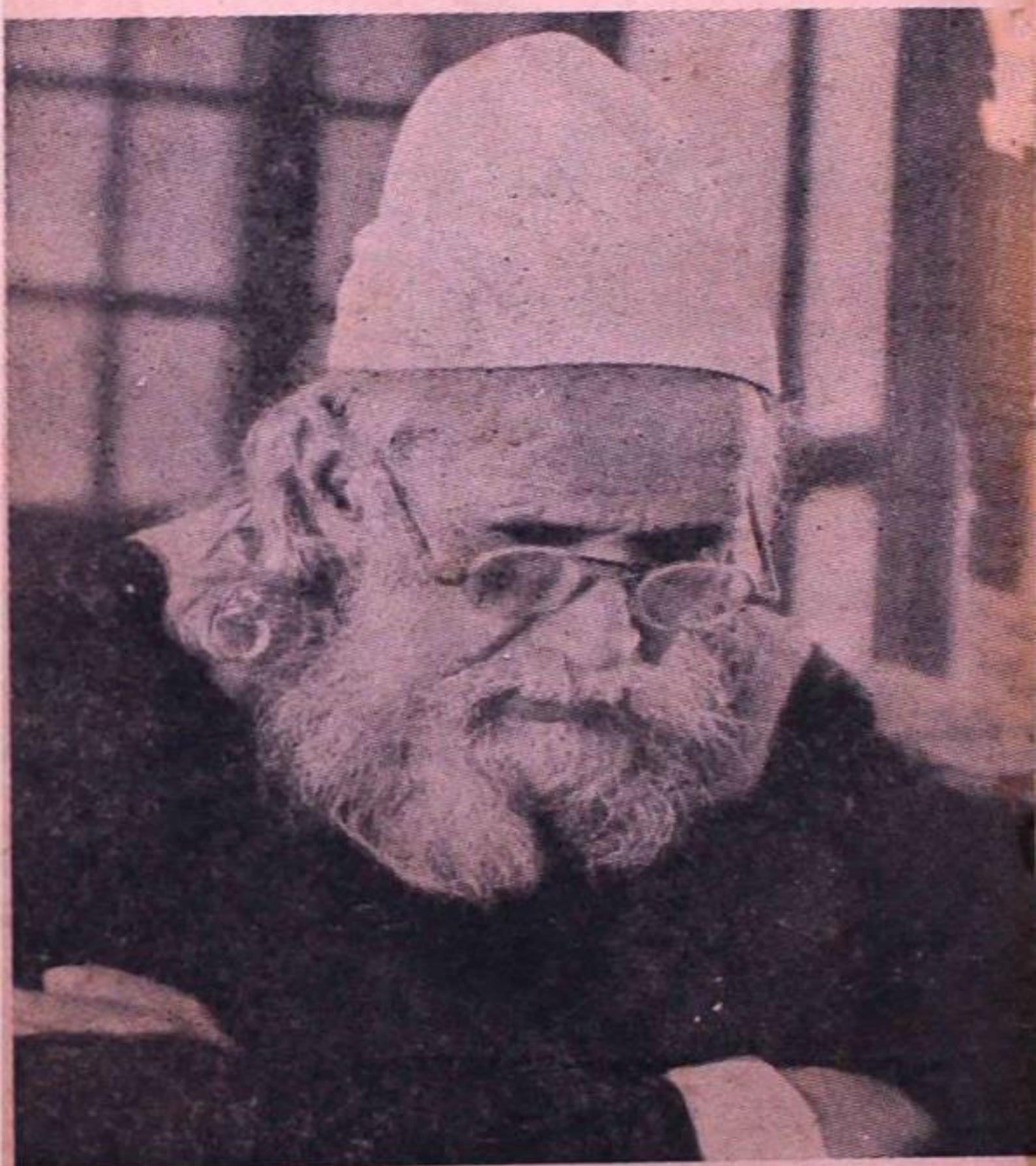
۱۹۵۳ء

خاص خاص عنوان

۱۔ بچپن اور شباب ۔۔۔۔۔۔ ۲۵
۲۔ تعلیم ۔۔۔۔۔۔ ۲۸
۳۔ تہیدستی ۔۔۔۔۔۔ ۲۹
۴۔ شادی ۔۔۔۔۔۔ ۳۷
۵۔ مخالفت ۔۔۔۔۔۔ ۳۹
۶۔ حلقہ نظام المشائخ ۔۔۔۔۔۔ ۴۲
۷۔ رسالہ نظام المشائخ ۔۔۔۔۔۔ ۴۵
۸۔ میرے اور خواجہ صاحب کے تعلقات ۔۔۔۔۔۔ ۴۷
۹۔ اہلیہ اول کا انتقال ۔۔۔۔۔۔ ۵۷
۱۰۔ امام صاحب مسجد درگاہ کا خواب ۔۔۔۔۔۔ ۵۸
۱۱۔ سفر کرنے اور اخبار نکالنے کا شوق ۔۔۔۔۔۔ ۶۲
۱۲۔ قلمی کتابیں جمع کرنے کا شوق ۔۔۔۔۔۔ ۷۶
۱۳۔ ولولے ۔۔۔۔۔۔ ۷۷
۱۴۔ مصر و شام و حجاز کا سفر ۔۔۔۔۔۔ ۸۱
۱۵۔ مالی عروج کی ابتدار ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۱
۱۶۔ اخبار توحید میرٹھ کا اجرار ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۵
۱۷۔ ایک تاریخی تقریر دکھو تکبیر ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۶

۱۸۔ شہادت کی افواہ ——— ۱۲۰
۱۹۔ تصنیف "تالیف" پر زور ——— ۱۲۸
۲۰۔ بڑے بڑے ملاقاتی ——— ۱۳۱
۲۱۔ نوابوں اور راجاؤں کے ساتھ ——— ۱۳۳
۲۲۔ خواجہ صاحب اور حضرت اکبرالہ آبادی ——— ۱۳۶
۲۳۔ عزیب ملنے والوں کے ساتھ ——— ۱۴۶
۲۴۔ خوش باشی ——— ۱۴۷
۲۵۔ ڈاڑھی کی سالگرہ ——— ۱۴۷
۲۶۔ انسداد ارتداد ——— ۱۴۸
۲۷۔ چند ملفوظات ——— ۱۵۹
۲۸۔ مولانا محمد علی سے تعلق ——— ۱۶۱
۲۹۔ مسز نائیڈو اور مہاتما گاندھی کی رائے ——— ۱۶۲
۳۰۔ درویشانہ حکمت عملی ——— ۱۶۵
۳۱۔ خواجہ صاحب کی سوجھ ——— ۱۷۳
۳۲۔ گاندھی جی سے ایک تاریخی گفتگو ——— ۱۷۳
۳۳۔ حسرت موہانی کی رائے ——— ۱۸۵
۳۴۔ اتحاد کانفرنس ——— ۱۸۷
۳۵۔ تاثرات ——— ۱۹۴
۳۶۔ روزنامچہ ——— ۱۹۷
۳۷۔ انداز گفتگو ——— ۲۰۱
۳۸۔ گھریلو زندگی ——— ۲۰۸

شروع بنام اللہ قلم کار کل   نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہٖ الکریم

الفاتحہ

سنہ ۱۹۱۹ء میں حضرت خواجہ صاحبؒ نے اپنی "آپ بیتی" لکھی تھی۔ اس وقت تک شاید ہندوستان کی کسی زبان میں کوئی آپ بیتی نہیں لکھی گئی تھی اردو ادب میں بھی یہ اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی۔ لیکن اس آپ بیتی کا مقصد محض مُریدوں کی اصلاح و تربیت تھا۔ اس لئے اس میں وہ تمام باتیں نہیں آئے پائیں جو ایک سوانح عمری میں ہونی چاہئیں اور جن کی آنیوالے زمانے کو ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ آنیوالے زمانے کو ان کے صحیح اور تفصیلی سوانح حیات کی تلاش ہوگی۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ایک بڑی سوانح عمری کے لئے زیادہ سے زیادہ مواد مہیا کردیں ہم چشم دید واقعات جمع کریں گے اور آیندہ لوگ ان کی مدد سے کتابیں لکھیں گے۔ حضرت خواجہ صاحب کی تصنیفات پر تبصرے اور تنقیدیں ہوتی رہیں گی۔ لیکن انکی تحریروں کو سمجھنے کے لئے جس پس منظر کو جاننے کی ضرورت ہوگی وہ ان کی سوانح عمری ہی مہیا کرسکتی ہے۔ خدا کے فضل سے ابھی حضرت خواجہ صاحب سے قریب رہنے والے بیشمار اصحاب زندہ ہیں اور ان میں سے بہت سے اہلِ قلم بھی ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ اپنی معلومات کو لکھ جائیں۔ حفاظت کرنے والا اللہ ہے۔ اس سلسلے میں واحدی صاحب اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ انھوں نے پہلی جلد مکمل کردی دوسری لکھی جارہی

ہے۔ اللہ تعالیٰ واحدی صاحب کو صحت وسلامتی عطا فرمائے کہ وہ کامیابی کے ساتھ اس کام کو پورا کر سکیں۔

میں نے واحدی صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ یہ سوانح عمری میں جولائی ۱۹۵۷ء میں شائع کر دوں گا اور بہت اعلیٰ پیمانے پر شائع کروں گا۔ اس وعدے کو میں پورا نہیں کر سکا۔ وجوہ کو بیان کرنا لا حاصل ہے۔ لاگت لگانے میں میں نے کسر نہیں کی۔ لیکن محض کتابت کی خرابی نے ساری لاگت پر پانی پھیر دیا۔ دوبارہ لکھوانے کا نہ وقت ہے اور نہ جیب اس کی اجازت دیتی ہے۔ اس کا مجھے افسوس ہی نہیں، صدمہ بھی ہے۔ واحدی صاحب کی جگہ کسی اور قلم کار سے میرا واسطہ ہوتا تو شاید خاصی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک وعدہ پورا نہیں کر سکا اس لئے واحدی صاحب سے یہ کہتے ہوئے ہچکچاتا ہوں کہ آئندہ ایڈیشن میں انشاء اللہ کوئی خامی نہیں رہیگی۔

واحدی صاحب سوانح عمری کے پہلے حصے کو ۱۹۱۳ء تک رکھنا چاہتے تھے لیکن باریک قلم سے لکھوانے کی وجہ سے ضخامت کم رہی اور اس مدت کو ۱۹۲۴ء تک بڑھانا پڑا۔ موٹے قلم سے لکھوانے میں بھی عبارت چار سو صفحے سے زیادہ میں آتی۔ اس لحاظ سے حضرت خواجہ صاحب کے وہ مرید اور مخلص میرے ممنون ہونگے جو سوانح عمری حاصل کرنے کو بے تاب ہیں لیکن زیادہ قیمت ادا نہیں کر سکتے۔

سوانح حیات لکھنے کا بوجھ اس وقت تو واحدی صاحب ہی پر ہے اور انشاء اللہ وہی اس کی تکمیل بھی کرینگے لیکن ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ اور ڈاکٹر مالک رام صاحب نے بھی وعدہ فرمایا ہے کہ وہ بھی اس سلسلے میں کچھ لکھیں گے۔

حضرت خواجہ صاحبؒ کی یہ سوانح عمری جو لوگ پڑھیں گے ان کی اکثریت حضرتؒ سے کچھ نہ کچھ ضرور واقف ہوگی اور جو لوگ ان سے واقف ہیں ان میں سے بہت سی ملا واحدی صاحب اور حضرت خواجہ صاحب کے باہمی تعلق سے بھی کسی نہ کسی حد تک

آشنا ہیں۔ دونوں کی زندگیوں کی ترقیاں ایک دوسرے سے مربوط اور متصل نظر آتی ہیں۔ اگر حضرت خواجہ صاحب واحدی صاحب کی زندگی میں داخل نہ ہوتے تو وہ کچھ اور ہوتی۔ اور خواجہ صاحب کو واحدی صاحب جیسا مخلص رفیق نہ ملتا تو شاندان کے کاموں کی رفتار بہت سست ہو جاتی۔

واحدی صاحب ایک بڑے ادیب اور معیاری "شہری" ہونے کے ساتھ بڑے اچھے منتظم اور بزنس مین بھی ہیں۔ ان جیسا مخلص اور صلاحیت رکھنے والا رفیق مل جانے کے بعد حضرت خواجہ صاحب کو یہ ضرورت نہ رہی کہ اپنے کارناموں کے انتظامی پہلو پر وقت صرف کریں۔ زندگی کے ابتدائی دور میں واحدی صاحب ہی نے ان کو یہ موقعہ بہم پہنچایا کہ وہ انتظامی اور دفتری جھنجھٹوں سے بے فکر ہو کر تصوف اسلام کو نئے تقاضوں کے موافق لکھتے رہیں۔ کہتے رہیں۔ برتتے رہیں۔

حضرت خواجہ صاحب کی ذات میں بڑی کشش تھی۔ یہ مقناطیسیت تمام تر تصوف کی تبلیغ میں صرف ہوئی۔ واحدی صاحب کو جب ان کے مقناطیس نے اپنی طرف کھینچا تو اس کا مقصد نہ تو محض یہ تھا کہ ایک ہوشیار نوجوان کو تصوف کے راستے پر ڈال دیا جائے اور نہ فقط یہ کہ ایک مخلص، محنتی اور ہم خیال منیجر تلاش کر لیا جائے حضرت خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ واحدی صاحب میں بھی انہی کی طرح مقناطیسیت پیدا ہو جائے۔ تصوف کی طرف کھینچنے والی مقناطیسیت!

واحدی صاحب حضرت خواجہ صاحب کے مرید ہو گئے تھے اور واحدی صاحب کے الفاظ میں:-

"خواجہ صاحب نے مجھے کارکن حلقہ نظام المشائخ اور نائب خواجہ حسن نظامی اور نہ جانے کیا کیا مشہور کر دیا تھا .... وہ چاہتے تھے کہ میں دوسرا حسن نظامی بن جاؤں۔"

لیکن واحدی صاحب دوسرے حسن نظامی ادبی حیثیت سے تو بننے کیلئے تیار ہو گئے مگر تصوف اور تبلیغ کی منزلیں مارنے کے لئے جوش و خروش سے آگے نہیں بڑھے۔ انھوں نے تصوف کی اشاعت میں بہت حصہ لیا لیکن خواجہ صاحب کی خلافت اور نیابت حاصل نہیں کی۔ وہ عقلیت پسند اور منطقی طبیعت کے آدمی ہیں۔ کم آمیز بھی بہت ہیں۔ دوسری طرف تصوف جرآت رندانہ، تبلیغی میل جول اور کیفیت نیاز کا تقاضہ بھی کرتا ہے۔ واحدی صاحب کو ان چیزوں سے فطری مناسبت ذرا کم ہے۔ وہ خود کہتے ہیں :-

> "میں گھوڑا نہیں بن سکا۔ بجلی کے دو تاروں میں کا ایک تار بن گیا میں خواجہ صاحب کے کاموں میں اس طرح شامل رہا جس طرح مثبت و منفی تار رہتے ہیں۔ گھوڑے کی حیثیت سے میں خواجہ صاحب کی رفتار میں حائل ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب کو دوڑنے نہیں دیتا تھا لیکن تار کی حیثیت سے ان کے کاموں کی بقا میں مدد گار تھا"

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب اپنے تصوف کو توبہ آمیز تصوف کہا کرتے ہیں واحدی صاحب کا تصوف بھی دیو بندی رنگ لئے ہوئے ہے ان کے پیر حضرت خواجہ حسن نظامی نے کتاب "مرشد کو سجدۂ تعظیم" لکھی تو واحدی صاحب نے ایک مضمون میں اس سے سخت اختلاف کیا۔ خواجہ صاحب نے اس کا جواب لکھا۔ اور پھر جواب الجواب کا سلسلہ خاصے دن تک چلتا رہا۔ حضرت خواجہ صاحب نے بیشمار لوگوں کو خطاب دیئے، اپنے چہیتے دوست، مرید اور رفیق کیلئے انھوں نے مُلّا کا لقب پسند کیا تھا لیکن اس مُلّا کو کوئی صاحب مُلّا کے رائج الوقت مفہوم سے نسبت نہ دیں یہ اشارہ کسی اور طرف ہے۔ واحدی صاحب کی صاف ستھری سنجیدہ، باوقار مودب اور عالمانہ شخصیت کو بدنام ملائیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ واحدی صاحب

بس ایسے ہی مُلّا ہیں، جیسے وہ اپنی تحریر سے ظاہر ہوتے ہیں۔) یہ لقب صرف واحدی صاحب کی شخصیت کے ایک پہلو ہی کو واضح نہیں کرتا بلکہ اس خلوص و محبت اور بے تکلفی کا بھی آئینہ دار ہے جس نے حضرت خواجہ صاحب اور واحدی صاحب کو زندگی میں کتنی ہی دفعہ ایک دوسرے سے روٹھایا اور منایا ہوگا۔

حضرت خواجہ صاحب اور واحدی صاحب کے تعلقات کی عمر تقریباً پچاس سال ہے۔ اور یہ پچاس سالہ تعلق بہت قریب کا تعلق تھا۔ ایسا کہ واحدی صاحب انکے دستِ راست رفیق بھی تھے، مرید بھی تھے اور بے تکلف دوست و ناقد بھی! اس لئے سوانح عمری کے لئے جس واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ واحدی صاحب کے پاس کافی ہے۔ البتہ اس کے لکھنے کے لئے واحدی صاحب نے جس وقت کا انتخاب کیا ہے وہ ان کی عمر کا ایسا وقت ہے جب حافظہ پوری طرح ساتھ نہیں دیتا۔ اس خامی کو انقلاب ۱۹۴۷ء نے کسی حد تک پورا کر دیا ہے۔

۱۹۴۷ء میں واحدی صاحب کو اپنے وطن دہلی اور حضرت خواجہ صاحب جیسے دوست احباب سے مجبوراً رخصت ہونا پڑا۔ اور اس ہجرت اور اس فراق نے ان کے دل میں ایک خاص سوز اور کیفیت پیدا کر دی۔ ماضی کی یادیں جو شاید بڑھاپے کے باعث مدھم پڑ جاتیں، دوستوں اور وطن کے فراق کے باعث روشن رہیں۔

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ تمام تر ادبی خوبیوں کے باوجود واحدی صاحب کی ۱۹۴۷ء سے پہلے کی تحریریں سیدھی دل تک نہیں پہنچتی تھیں۔ سب سے پہلے خیال موضوع کی خوبیوں کی طرف جاتا تھا اور وہ خوبیاں دل کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں اور اب یہ حال ہے کہ واحدی صاحب کی بات دل تک پہلے پہنچ جاتی ہے اور پھر خیال ادبی خوبیوں اور موضوع کی طرف جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ کیفیت واحدی صاحب کے دل کے سوز و گداز کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ زیرِ نظر سوانح عمری میں میرے

لیے اور حضرت خواجہ صاحب کے دیگر متعلقین کے لیے تو خیر اور وجہ سے بھی ایک
خاص کیف ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ غیر متعلق لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر
نہیں رہیں گے۔

واحدی صاحب اردو کے صاحب طرز انشا پرداز ہیں، دہلی کی ٹکسالی زبان
کو وہ بڑی شگفتگی اور دل آویزی سے لکھتے ہیں۔ ان کی تحریر بڑی سادہ۔ عام فہم اور
پر اثر ہوتی ہے۔ کوئی جملہ اور جملے کا کوئی لفظ غیر ضروری اور بھرتی کا نہیں ہوتا۔ وہ
جو بات لکھتے ہیں باون تولے پاؤ رتی ہوتی ہے اور اس بات کو کہنے کے لیے الفاظ بھی
منتخب اور نپے تُلے ہوتے ہیں۔ یہ ناپ۔ تول غالباً وہ شعوری طور پر نہیں کرتے یہ
ان کی فطرت کا ایک جزو ہے۔

واحدی صاحب کا پیش لفظ میں یہ لکھنا کہ

"میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ سوانحعمری خواجہ حسن نظامی لکھتے
وقت کبھی میری تیوری پہ بل نہیں آیا اور کبھی میرا چہرہ شگفتہ
نہیں ہوا۔ ذاتی وابستگی کی وجہ سے تاثرات ضرور رہے ہیں۔ لیکن اتنی
بات کا یقین مانیے کہ خواجہ صاحب کیخاطر کہیں مبالغہ نہیں کیا گیا ہو مبالغہ اور
غلط بیانی میں کسی کے لیے نہیں کر سکتا۔"

بہت صحیح ہے۔ اگر وہ خاطر کا خیال رکھنے والے ہوتے تو اپنے پیر حضرت
خواجہ حسن نظامی کے عقیدہ سجدۂ تعظیم پر اعتراض نہ کرتے۔

اس وقت سوانح عمری کا پہلا حصہ شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ ۱۹۲۴ء تک ہے
اس میں سفرنامہ مصر و حجاز و شام و فلسطین کے اقتباس ذرا تفصیل سے ہیں۔
لیکن اس سے تین فائدے ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ خواجہ صاحب کی طرز تحریر کے
نمونے آ گئے۔ دوسرے یہ کہ ان سے خواجہ صاحب کی ذہنی کیفیت اور ارادوں کی

غمازی ہوتی ہے ... اور تیسرے یہ کہ ان سے اس زمانے کا سیاسی، سماجی معاشی اور ثقافتی پس منظر واضح ہو جاتا ہے، جس کے بغیر سوانح عمری کو سمجھنا اور فائدہ حاصل کرنا مشکل ہوتا۔

حسن ثانی نظامی

حجرۂ قدیم درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رح
نئی دلی۔

بقلم خود

خواجہ حسن نظامی - پیدائشی نام علی حسن - پیشہ قلم کاری
عمر ستر سال - بچپن غم آلود - جوانی بے سود - بڑھاپا
خوش حال و خوش خیال - طلوع آفتاب سے پہلے قسمت
روشن رہیگی - طلوع کے بعد روشنی ترقی کریگی - زوال
آفتاب سے غروب تک سرنگوں رہیگی - غروب کے بعد
پہلا گھنٹہ اچھا رہے گا پھر اس کے بعد قسمت میں زوال
شروع ہوگا جو رات کے تین بجے تک رہے گا -

خواجہ حسن نظامی ۔ پیدائشی نام علی حسن ۔ پیشہ قلم کاری ۔ عمر
۷۳ سال ۔ بچپن غم آلود ۔ جوانی بے سود ۔ بڑھاپا خوش حال
و خوش خیال ۔ طلوع آفتاب سے پہلے قسمت روشن رہے گی ۔
طلوع کے بعد روشنی ترقی کرے گی ۔ زوالِ آفتاب سے غروب
تک سرنگوں رہے گی ۔ غروب کے بعد پہلا گھنٹہ
اچھا رہے گا ۔ اس کے بعد قسمت میں زوال شروع ہوگا ۔
جو رات کے تین بجے تک رہے گا ۔

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

خاکِ خم سے وہ جام اُبھرا دیکھو
سورج وہ قریبِ شام اُبھرا دیکھو
صوفی کی حیات ہے مسلسل تگ و دو
مرقد سے وہ اک پیام اُبھرا دیکھو

تاریک فضا کو جگمگایا تو نے
ویرانۂ حیات کو سجایا تو نے
ہر تودۂ خاک کو کیا مشرقِ نور
ذرّات کو خورشید بنایا تو نے

روحِ بے کیف کو لطافت بخشی
اور ذہن کو فکر کی حرارت بخشی
وجدان و عمل کو ایک کر کے تو نے
رومی کے تخیل کو حقیقت بخشی

ساغر نظامی

سوانح عمری

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

نوشتہ :۔
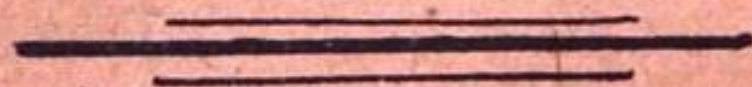
ملّا واحدی دہلوی

پیش لفظ

دلّی میں ندوۃ العلماء کا وہ سالانہ اجلاس ہو رہا تھا جسے مصر کے علاّمہ رشید رضا نے صدارت کی عزت بخشی تھی اور جس میں ہونے والے علاّمہ سیّد سلیمان ندوی اور علاّمہ عبدالسّلام ندوی سے بحیثیت جیّد طالب علم عربی کی تقریریں کرائی گئی تھیں۔

علاّمہ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد مولوی عبدالاحد، مالک مطبع مجتبائی کے ہاں برابر برابر کمروں میں مقیم تھے میں اور خواجہ صاحب علاّمہ شبلی سے ملنے گئے نظام المشائخ کا پہلا خاص نمبر (شہید نمبر) تازہ تازہ نکلا تھا۔ اس میں سرمد شہیدؒ پر مولانا ابوالکلام کا مضمون چھپا تھا۔ علاّمہ شبلی نے فرمایا۔ سرمدؒ کے حالات اتنے ہی ملتے ہیں، جتنے ابوالکلام نے لکھ دیئے ہیں لیکن حالات کو پھیلایا بہت ہے۔ اکٹھے بیس صفحے لکھ ڈالے۔ میں لکھتا تو دو صفحوں سے زیادہ نہ لکھتا۔ مواد صرف دو صفحوں کا ہے۔ باقی ابوالکلام کی ادبیت ہے۔

اس کے بعد کہا کہ مورخ کی تحریر ایسی ہونی چاہیئے کہ پڑھنے والا محسوس نہ

کرے کہ یہاں لکھنے والے کی تیوری چڑھی ہے۔ اور یہاں لکھنے والے کا چہرہ کھِل گیا ہے۔

میں نے علامہ شبلی کے ان فقروں کو گرہ میں باندھ لیا اور آج جب کہ خواجہ صاحب کی سوانح عمری پیش کر رہا ہوں، مجھے ان فقروں کی یاد بار بار آرہی ہے، کیونکہ سوانح عمری تاریخ ہوتی ہے۔

میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ سوانح عمری خواجہ حسن نظامی لکھتے وقت کبھی میری تیوری پر بل نہیں آیا، اور کبھی میرا چہرہ شگفتہ نہیں ہوا۔ ذاتی وابستگی کیوجہ سے تاثرات ضرور رہے۔ لیکن اتنی بات کا یقین مانیئے کہ خواجہ صاحب کی خاطر کہیں مبالغہ نہیں کیا گیا۔ میں مبالغہ اور غلط بیانی کسی کے لئے نہیں کر سکتا۔

واحدی

۶ رصفر المظفر ۱۳۷۷ھ

۲ ر ستمبر ۱۹۵۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دِلّی بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہلاتی ہے۔ اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دِلّی میں فقط بائیس بزرگ مدفون ہیں۔ بزرگوں کی تعداد تو حدِ شمار سے باہر ہے لیکن بائیس بزرگ ایسے ہیں کہ دلّی کے سوا ہندوستان کے کسی دوسرے شہر کو اُن جیسے انکھٹے بائیس بزرگوں کا مدفن ہونے کی سعادت حاصل نہیں ہے، ایسے بائیس بزرگ جن کا نام حضرت خواجہ بزرگ معین الدین اجمیریؒ اور حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔

دِلّی کے ان بائیس ممتاز اولیاء اللہ میں نمبر ایک قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ہے اور نمبر دو سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہیؒ کا۔ خواجہ حسن نظامی سلطان المشائخ کے خاندان میں ۲ محرم ۱۲۹۶ھ کو پیدا ہوئے۔ سنہ عیسوی ۱۸۷۹/۱۸۸۰ سمجھئے۔

حضرت سلطان المشائخ کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی حضرت، عمر بھر مجرد رہے۔ خواجہ حسن نظامی مولانا سید بدر الدین اسحٰقؒ کی نسل سے ہیں جو حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ (سلطان المشائخ کے پیر) کے داماد تھے۔

حضرت بابا صاحب اور مولانا بدر الدین اسحٰقؒ کے انتقال کے بعد، مولانا بدر الدین اسحٰقؒ کی بیوہ اور یتیم بچوں، یعنی پیر کی بیٹی اور نواسوں کو حضرت سلطان المشائخؒ نے دلی بلا لیا تھا اور بچوں کو اولاد کی طرح پالا تھا، خاص اہتمام سے تعلیم و تربیت کرائی تھی۔ ان میں سے سید محمدؒ جوان ہو گئے تو سلطان المشائخؒ نے انھیں اپنی امامت نماز[۱] عطا کی، اور امام اُن کا لقب پڑ گیا، جہاں پڑھے گا خواجہ

---

[۱] مسجد خانقاہ کے بعد مسجد درگاہ کی امامت خواجہ صاحب کے خاندان میں صدیوں رہی، مگر کچھ عرصے سے امامت حضرت خواجہ ابوبکر مصلّے بردار کے خاندان کے ایک صاحب کے پاس چلی گئی تھی مسجد درگاہ میں اب ان کی اولاد نماز پڑھاتی ہے۔ ان صاحب کے بیٹے پوتوں میں سے کسی لائق فرد کو امام مقرر کیا جاتا ہے۔ مقررہ امام غیر حاضر ہو تو پھر امامت حضرت خواجہ ابوبکر کی اولاد کے لئے مختص نہیں ہے۔ متعلقین درگاہ میں سے کوئی بھی نماز پڑھا دیتا ہے۔

درگاہ سے متعلق چار خاندان چلے آتے ہیں۔ ایک خواجہ صاحب کا خاندان حضرت خواجہ سید محمد امامؒ کی اولاد جسے نبیرگان کہتے ہیں، دوسرا خاندان یاروشیان حضرت خواجہ رفیع الدین ہارونؒ کی اولاد۔ یہ خاندان ختم ہو چکا ہے اور اس کا حصہ یا حق باقی تین خاندانوں کے مختلف افراد میں منتقل ہو گیا ہے۔ تیسرا خاندان ہندوستانیان حضرت خواجہ ابوبکرؒ کی اولاد۔ چوتھا خاندان قاضی زادگان حضرت خواجہ قاضی محی الدین کاشانیؒ کی اولاد۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۳۵ پر)

سید محمد امام اور مولانا سید محمد امام پڑھیے گا۔ خالی سید محمد کم پڑھے گا۔

حضرت سلطان المشائخ حضرت سید محمد امام پر بہت مہربان تھے، اپنے سامنے لوگوں کو ان کا مرید کراتے تھے۔ اپنی مجلس میں سب سے اونچی جگہ بٹھاتے تھے۔ حضرت سلطان المشائخ کی موجودگی میں حضرت سید محمد امام میر مجلس اور صاحب سماع بنائے جاتے تھے، المختصر خواجہ سید محمد امام کا بڑا بلند مرتبہ تھا۔

حضرت سلطان المشائخ نے جب حضرت بابا صاحب سے بیعت کی ہے تو بابا صاحب نے سلطان المشائخ کو ابتدائی تربیت کے واسطے خواجہ سید محمد امام کے والد مولانا سید بدر الدین اسحٰق کے سپرد کیا تھا۔ خواجہ سید محمد امام پیر کے نواسے ہی نہیں تھے، تربیت کنندہ کے بیٹے بھی تھے۔ پھر خواجہ سید محمد امام کی اولاد کے حضرت سلطان المشائخ کی بہن اولاد سے رشتے ہوتے رہے یہی وجہ تھی کہ خواجہ صاحب ۱۹۰۵/۱۹۰۴ کے مضامین میں اپنے تئیں "خواہرزادہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی" لکھا کرتے تھے، یوں کہنا چاہیے کہ خواجہ حسن نظامی حضرت بابا صاحب کی بیٹی حضرت فاطمہ، اور حضرت سلطان المشائخ کی بہن کی اولاد ہیں اور ان دونوں قرابتوں کی بنا، پر انکا خاندان درگاہ سلطان المشائخ میں امتیاز رکھتا ہے۔

مشائخ سلف اپنا جانشین اُسے مقرر کیا کرتے تھے جسے جانشینی کا سب

حاشیہ بقیہ صہ ۳۲:۔ چاروں خاندانوں میں مہینے کا ایک ایک ہفتہ تقسیم ہے۔ خاندان ہارونیان کی باری بھی آتی ہے اور اسے باقی تین خاندانوں کے وہ افراد باری باری انجام دیتے ہیں جن تک یہ باری منتقل ہو کر پہنچ گئی ہو۔ اپنی اور خاندانِ ہارونیان کی باری پر باری والا خاندان درگاہ کا مکمل انچارج ہوتا ہے، انتظامات اور آمد و خرچ سب کا۔

سے زیادہ اہل پاتے تھے۔ خواجہ معین الدینؒ کے جانشین خواجہ قطب الدین رح۔ خواجہ قطب الدین رح کے جانشین بابا فرید الدین رح۔ بابا فرید الدینؒ کے جانشین خواجہ نظام الدین رح۔ ان میں ایک بھی دوسرے کا رشتہ دار نہیں تھا۔ خلفا ہزاروں ہوتے تھے، لیکن خلفا سے کام لینے والا جسے مقرر کیا جاتا تھا، اُسے دیکھ لیا جاتا تھا کہ کام لینے کی کتنی صلاحیت ہے، چنانچہ یہ صلاحیت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رح نے حضرت خواجہ نصیر الدینؒ میں دیکھی۔ شجرِ اسلام کا جو بیج حضرت خواجہ معین الدین نے بویا تھا وہ حضرت خواجہ نصیر الدین رح کے ہاتھوں پھل لایا۔ حضرت خواجہ نصیر الدین رح خود تو چراغ دہلی بنے۔ دہلی میں بیٹھے رہے مگر اُنھوں نے اپنے پیر کی طرح اسلام کے مبلغ ہندستان کے گوشے گوشے میں پھیلا دیے۔ بلکہ چین تک اسلام کی اشاعت کرائی۔ چین تشریف لے جائیے، آج بھی وہاں متعدد نظامی خانقاہیں ملیں گی۔

تعلقِ خاطر کا پاس ہوتا تو حضرت سلطان المشائخ دلی و سجادہ حضرت امیر خسروؒ کو عطا فرماتے۔ قرابت کا پاس ہوتا تو حضرت خواجہ سید محمد امامؒ کے حصہ میں یہ نعمت آتی۔ حضرت امیر خسرو اور حضرت خواجہ سید محمد امامؒ سے وہ کام لیے جنھیں وہ انجام دے سکتے تھے اور حضرت خواجہ نصیر الدین سے وہ کام لیا گیا جسے وہ انجام دے سکتے تھے۔

تعلقِ خاطر اور قرابت، جانشینی و سجادگی میں مانع نہیں ہے۔ حضرت سلطان المشائخ کی بہن کے پوتے حضرت خواجہ سید تقی الدین نوح انتقال نہ کر جاتے تو شاید سجادگی کا شرف اُنھیں بخشا جاتا۔ اُن سے تعلقِ خاطر بھی غیر معمولی تھا اور حقیقی بھانجے کے فرزند اور متبنیٰ تھے، وہ سجادہ نشینی کے اہل تھے مگر عمر نے وفا نہ کی۔

حضرت خواجہ سید تقی الدین وہ بزرگ ہیں جن کے انتقال سے بسنت کے میلہ کا مسلمانوں میں رواج ہوا ہے، یہ واقعہ بیان کر دینے کے لائق ہے:۔

حضرت سلطان المشائخؒ خواجہ سید تقی الدینؒ کو سجادہ نشینی کی تربیت دے رہے تھے۔ خواجہ سید تقی الدین کی رحلت کا حضرت سلطان المشائخ نے اتنا صدمہ کیا کہ بولنا چھوڑ دیا۔ امیر خسروؒ۔ امیر حسن علاء سنجریؒ۔ سید محمد امامؒ اور جملہ مقربین نے بہتیرے جتن کر لیے کہ حضرت کا دل بہلے، مگر غم کے بادل کسی طور نہ چھٹے۔

بسنت پنچمی کا زمانہ تھا۔ بسنت پنچمی دلی کے ہندو کالکا دیوی پر سرسوں کے پھول چڑھا کر مناتے ہیں۔ کالکاجی کا مندر حضرت سلطان المشائخ کی خانقاہ اور درگاہ سے تین ساڑھے تین میل آگے ہے۔ خانقاہ کے کھنڈرات، مقبرہ ہمایوں کی بغل میں ہیں۔ خانقاہ کے قریب سے ہندو سرسوں کے پھول لئے جوق در جوق اور انبوہ در انبوہ گزر رہے تھے، امیر خسرو کو نئی تجویز پیر کی طبیعت بحال کرنے کی سوجھی۔

امیر صاحب نے بھی سرسوں کے پھول منگوائے اور حضرت سلطان المشائخ کی خانقاہ پہنچے۔ معلوم ہوا حضرت خانقاہ میں نہیں ہیں۔ چبوترہ یاران تشریف لے گئے ہیں، جہاں خواجہ سید تقی الدین کی قبر ہے۔ چبوترہ یاران نو چبوترے تھے جو ایک تالاب کے گرد جلال الدین خلجی کے کوشک لال کے پاس حضرتؒ نے بنوائے تھے۔ ان چبوتروں پر حضرت کے یارانِ طریقت اور اقربا اور احبا دفن کئے جاتے تھے۔ امیر صاحب نے چبوترہ یاراں کا راستہ لیا اور راستہ ہی سے راز کما دسہر دیو د نو مسلم) خواجہ سید محمد امامؒ اور خواجہ سید موسیٰؒ کو بھی لے لیا۔

حضرت سلطان المشائخ چبوترے کے بجائے کوشک لال کے گنبد کے اندر تشریف فرما تھے اور دروازہ پر حضرت کا خادم مبشر کھڑا تھا۔ مبشر نے کہا حضرت اندر ہیں۔ مجھے حکم دیا ہے کہ یہاں کھڑا رہوں۔ ابھی خواجہ تقی الدین کے مزار سے گئے تھے واپس لوٹے تو چہرے سے انتہائی حزن ملالی ٹپک رہا تھا۔ مبشر کا منشاء

ظاہر تھا کہ امیر خسروؒ وغیرہ اندر نہ جائیں۔ مگر امیر خسروؒ نے پھر بھی سوال کیا کہ ہم اندر جا سکتے ہیں یا نہیں۔ مبشر نے جواب دیا، کیا عرض کروں، آپ حضرات کو تو روک نہیں سکتا۔

حضرت سلطان المشائخ سر جھکائے اور زمین کی طرف نگاہ جمائے ایک پتھر پر بیٹھے تھے، وہ پتھر اس وقت تک موجود ہے اور وہیں موجود ہے۔ امیر خسروؒ گنبد میں گھستے ہی ٹوپی ٹیڑھی کر کے رقص کے انداز سے جھومے۔ حضرت سلطان المشائخ کی نگاہ اُٹھی اور حضرت کا چہرہ کسی قدر متبسم ہو گیا اور زبان سے نکلا۔ جیست۔ کیا ہے۔ امیر صاحب نے فوراً بڑھ کر سرسوں کے پھول قدموں میں ڈال دئے اور کہا۔ "عرب یار توری بسنت منائی"۔ آج ہندو اپنے بُت پر بسنت کے پھول چڑھا رہے ہیں، میں اپنے بُت پر پھول چڑھانے حاضر ہوا ہوں ؎

خلق می گوید کہ خسرو بُت پرستی می کند!
آرے آرے می کنم با خلقِ عالم کار نیست

پھر گانا شروع کر دیا ؎

اشک ریز آمدہ ابرو بہار
ساقیا گل بریز و بادہ بیار

گانے میں خواجہ سیّد محمد امامؒ اور خواجہ سیّد موسیٰ بھی شریک ہو گئے تینوں حضرات اس شعر کے مناسب ہندی اور فارسی کے اور اشعار بھی شامل کرتے جاتے تھے۔ غرض ایسا سماں جما کہ حضرت سلطان المشائخ کو وجد آگیا اور حضرت بھی فرمانے لگے۔ ہاں۔ اشک ریز آمدہ ابرو بہار

کچھ سکون ہوا تو حضرت سلطان المشائخ نے سرسوں کے پھول اُٹھائے اور فرمایا۔ چلو تقی الدین کی قبر پر چلیں، یہ پھول وہاں چڑھا دیں۔

اُس دن سے دلّی کے مسلمانوں نے اس موسمی میلہ کو اپنا لیا۔ جس دن ہنڈ کالکا دیوی پر پھول چڑھاتے ہیں۔ اُسی دن نماز عصر کے بعد مسلمان اس مقام پر جمع ہوتے ہیں، جہاں کوشک لال کا گنبد تھا۔ وہ پتھر باقی ہے جس پر سلطان المشائخ تشریف رکھتے تھے۔ حضرت خواجہ صاحب نے یہاں کتبہ بھی لگا دیا ہے اس جگہ سے جلوس کی شکل میں حضرت خواجہ سیّد محمد امام ؒ کے مزار پر جاتے ہیں۔ اور پھول چڑھاتے ہیں، وہاں سے خواجہ سیّد تقی الدین نوح کے مزار پر آتے ہیں اور پھول چڑھاتے ہیں اور پھر مجمع حضرت سلطان المشائخ کے مزار پر جاتا ہے دلّی کے قوال گاتے ہیں ؎

اشک ریز آمدہ ابر و بہار
ساقیا گل بریز و بادہ بہار

اور واقعہ متذکرہ بالا کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔

بستی نظام الدین اولیاء میں بسنت کی شکل بس اتنی ہے۔ شہر میں ہندو مسلمان اسے مل کر مناتے ہیں اور اس کا سلسلہ مہینہ ڈیڑھ مہینے چلتا ہے آج فلاں مزار پر جمگھٹا ہے۔ کل فلاں ہندو محلہ میں۔ پرسوں فلاں مسلمان محلہ میں۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم — خیر بیان خواجہ صاحب کے خاندان کا تھا۔ درگاہ حضرت سلطان المشائخ سے متعلق چار خاندان ہیں۔ باقی تینوں خاندانوں کے اجداد بھی حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں ہمہ وقت کے حاضر باش تھے۔ سب عظیم شخصیتوں کے نام لیوا ہیں، لیکن جب خواجہ صاحب پیدا ہوئے ہیں تو خواجہ صاحب کے خاندان اور باقی تینوں خاندانوں کی حالت وہی تھی جو سب مسلمانوں کی تھی۔ بلکہ زیادہ اُونچائی سے گرنے والے زیادہ

نیچائی کی طرف جارہے تھے۔ ایک درگاہ سلطان المشائخ کیا، ملک بھر کی درگاہوں کے پیرزادے زیادہ سے زیادہ نیچے گر چکے تھے۔ دنیادی بادشاہ کی اولاد، اور دینی بادشاہوں کی اولاد کا، اور مسلمانوں سے زیادہ خراب حال تھا۔

تقدس کا معاملہ اللہ جانے، ظاہری علم و فضل پیرزادگانِ درگاہ سلطان المشائخ میں گھٹتے گھٹتے اتنا رہ گیا تھا کہ اردو کا خط ہر پیرزادہ نہ لکھ سکتا تھا۔ خواجہ صاحب کے والد حافظ سید عاشق علی قرآن مجید کے حافظ تھے، مگر اردو لکھنے پڑھنے سے لاچار، خواجہ صاحب کے بڑے بھائی سید حسن علی کو قدرے اردو آتی تھی۔ وہ کہیں باہر جاتے اور خط لکھتے تو باپ اسے لوگوں سے پڑھواتے پھرتے تھے ایک دفعہ خط پڑھوایا اس میں بعض راز کی باتیں تھیں، انھوں نے حسرت سے کہا کاش علی حسن پڑھے تو میں اوروں کو خط کیوں دکھاؤں۔

علی حسن، خواجہ صاحب کا اصلی نام ہے۔ علی حسن نظامی کو خواجہ صاحب کے ذوق نے مختصر کر کے حسن نظامی کر لیا تھا۔ خواجہ صاحب بڑے بھائی سے بہت چھوٹے تھے۔ ان کی پڑھنے لکھنے کی عمر تھی، خواجہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ابا کے اس حسرت بھرے فقرے نے میرے دل میں شوقِ علم کا بیج بو دیا۔

خواجہ صاحب کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے:۔

(۱) حضرت علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ۔ (۲) حضرت امام حسین رضؓ (۳) حضرت زین العابدین رحؒ (۴) سید عمر اشرفؒ (۵) سید زکریا اصغر محدثؒ۔ (۶) سید قطب الدین عمر شجریؒ (۷) سید عبد اللہ محمدؒ (۸) سید علی صدر الدینؒ۔ (۹) سید حسن جلال الدینؒ۔ (۱۰) سید احمد فتح اللہؒ (۱۱) سید محمدؒ (۱۲) سید احمدؒ (۱۳) سید محمدؒ (۱۴) سید محمودؒ (۱۵) سید احمدؒ (۱۶) سید منہاج الدینؒ (۱۷) خواجہ سید اسحقؒ (۱۸) خواجہ سید علیؒ (۱۹) مولانا سید بدر الدین اسحقؒ (۲۰) خواجہ سید محمد امامؒ (۲۱)

سیّد داؤد رح (۲۲) سید علیم الدین رح (۲۳) سید حسین (۲۴) سید مبارک رح (۲۵) سید محمد رح (۲۶) سیّد خواجہ رح (۲۷) سیّد جلال الدین رح (۲۸) سید ایوب رح۔ (۲۹) سیّد ابو محمد رح (۳۰) سیّد عبداللہ رح۔ (۳۱) سیّد عبدالقادر رح (۳۲) سیّد فضل علی رح (۳۳) سیّد ہدایت علی رح۔ (۳۴) سید حسین علی رح (۳۵) سیّد عاشق علی رح (۳۶) خواجہ حسن نظامی رح۔

نمبر ۳۲ سیّد فضل علی شہنشاہ ہند عالمگیر ثانی کے عہد میں تھے۔ خواجہ صاحب کے ہاں ایک فرمان محفوظ ہے جس میں عالمگیر ثانی نے آصف جاہ نظام الملک، وزیر سلطنت سے کہا ہے کہ میر فضل علی نبیرہ حضرت گنج شکر و متولی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رکو فلاں فلاں چار دیہات دہلی کے علاقہ میں دے جائیں۔ چاروں دیہاتوں کے نام درج ہیں۔ لیکن گردش فلک اور انقلابات نے شاید میر فضل علی کے بیٹے، اور پوتے کو بھی اُن سے متمتع نہیں ہونے دیا۔ پڑپوتے، یعنی خواجہ صاحب کے والد تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے تھے اور خواجہ صاحب پر تو والد کا انتقال ہو جانے سے عسرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

خواجہ صاحب کا بچپن اور شباب

خواجہ صاحب والد کے انتقال کے وقت بارہ برس کے تھے۔ والد نے انتقال سے ایک سال قبل تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خاں لے جا کر حضرت شاہ اللہ بخش رح کا مُرید کرا دیا تھا۔ یہ خواجہ صاحب کا پہلا سفر تھا۔ دوسرا سفر سولہ سال کی عمر میں بڑے بھائی کے ساتھ چاچڑاں شریف، علاقہ بھاولپور کا کیا اور حضرت خواجہ غلام فریدکی کی ملاقات سے شرف یاب ہوئے اور بھائی کے کہنے سے اُن کے ہاتھ پر بھی بیعت کی۔ لیکن یہ دونوں ارادتیں بالکل کم عمری کی تھیں۔ سوچ، سمجھ کر اور اپنے ارادہ سے چوبیس سال کی عمر میں حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رح کا ہاتھ پکڑا تھا۔ کیونکہ حضرت

شاہ اللہ بخش اور حضرت خواجہ غلام فرید خواجہ صاحب کو مُرید کرنے کے بعد زیادہ عرصے زندہ نہیں رہے تھے۔

حضرت پیر مہر علی شاہ سے مُرید ہونے کا قصہ خواجہ صاحب نے یوں بیان کیا ہے:۔

"مُرید ہونے کی ترغیب میرے دل نے دی، میں حضرت خواجہ اللہ بخش صاحب رحمتہ اللہ علیہ اور خواجہ غلام فرید صاحب رح کو کامل اور مکمل پیر تصور کرتا تھا۔ مگر اُن کے بقید حیات نہ ہونے کے سبب ایک زندہ ہادی کی ضرورت تھی، اس واسطے اکثر استمداد کیا کرتا تھا کہ کسی رہنما کا پتہ ملے۔ ایک رات حضرت محبوب الٰہی رح کو خواب میں دیکھا کہ حضور دریافت فرماتے ہیں کس کے مُرید ہو؟ عرض کیا میں آپ سے پوچھتا ہوں کس کا مُرید ہونا چاہیئے؟۔ فرمایا اپنے آپ کو دیکھو، میں نے تعبیر لی کہ اصلاحِ نفس کا اشارہ ہے۔ جس کی تعمیل میں میں نے مدتوں کتابیں دیکھ دیکھ کر مجاہدے کئے۔ اِس کے بعد خیال آیا کہ حضرت محبوب الٰہی نے میرے نسب کا اشارہ نہ کیا ہو کہ میں حضرت محبوب الٰہی کے نسب میں ہوں۔ اپنے آپ کو دیکھنا گویا خود حضرت کے طرزِ عمل کو دیکھنا ہے، اس واسطے ارادہ ہوا کہ جس طرح حضرت محبوبؒ الٰہیؒ اپنے پیر حضرت بابا گنج شکر کی خدمت میں دہلی سے پاک پٹن شریف پیدل جایا کرتے تھے، میں بھی پیدل جاؤں، مگر اتنی ہمت نہ کر سکا۔ تاہم منچن آباد سے پاک پٹن پیدل گیا۔ جو غالباً بارہ کوس کا فاصلہ ہے اور ریگستانی راستہ ہے۔

یہ سفر بہت بے سر و سامانی کا تھا۔ نہ کوئی آدمی ساتھ تھا۔ نہ

پیسہ جیب میں تھا۔ نہ روٹی۔ بھوکا پیاسا ایک شوق اور لطف میں روانہ ہوگیا تھا۔

بارے بجے دن کو دریا کے کنارے پہنچا کشتی موجود نہ تھی۔ پیدل چلنے کی عادت نہ تھی۔ راستہ صاف نہ تھا۔ گرمی کی شدت اور دھوپ کی تیزی سے حواس گم تھے، کنارہ پر جاکر بیٹھ گیا۔ بھوک نے اتنا بے حال کیا کہ نیم غشی کی سی حالت طاری ہوگئی۔ اتنے میں کوئی درویش مسافر آئے۔ اُن کے پاس آدھ سیر کی ایک روٹی تھی، اُس میں سے اُنھوں نے مجھے پاؤ روٹی دی اور مسکرا کر کہا "اسے کھاؤ۔ پانی پیو، تم کو تو روٹی تقسیم کرنی ہے۔ ابھی سے بے ہوش ہوگئے" میں نے وہ ٹکڑا کھایا، دریا کا پانی پیا، کشتی آگئی اُس میں سوار ہوکر ہم دونوں پار گئے اور شام تک پاک پٹن پہنچ گئے۔

رات کو میں نے حضور بابا صاحب کے مزار پر عرض کیا کہ طلب شیخ میں حاضر ہوا ہوں، صبح خود بخود حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب کی طرف دل مائل ہوا (جو اتفاق سے وہاں موجود تھے) اور میں نے فوراً اُن کے پاس حاضر ہوکر بیعت کرلی"۔

یہ چوبیس سال کی عمر کا واقعہ ہے اور لکھا جا رہا ہے ۱۹۱۹ء عیسوی، قریباً چالیس اکتالیس سال کی عمر میں، جبکہ مالی حالت بہتر ضرور تھی، لیکن بزرگ مذکورہ بالا کی پیشین گوئی پوری ہونے کے لائق نہیں تھی۔

بچپن اور شباب خواجہ صاحب کا افلاس میں گزرا، شباب ڈھل رہا تھا کہ دولت نے صورت دکھانی شروع کی۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ صاحب میں دولتمندی

کے عیب نہیں تھے۔

دولت مندی کے عیب نہ ہونے کی وجہ معلوم ہے، لیکن افلاس کے عیبوں سے خواجہ صاحب کیونکر بچے رہے، یہ حیرت ناک حقیقت ہے۔

تعلیم

والد کے کہنے سے خواجہ صاحب نے پڑھنے لکھنے پر توجہ شروع کردی تھی بہادر شاہ بادشاہ کے سمدھی مرزا الٰہی بخش، جن کی انگریزوں نے دس ہزار روپے ماہوار پولیٹکل پنشن مقرر کی تھی، اُن کے بعض لواحق مستقلاً بستی حضرت نظام الدین میں رہنے لگے تھے۔ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کاندھلہ ضلع مظفرنگر کے مولانا محمد اسمٰعیل فرماتے تھے۔ خواجہ صاحب کو بھی مولانا کے پاس بٹھادیا گیا خواجہ صاحب کی زبان کو جو آپ اتنا لوچدار پاتے ہیں، یہ ہم سبق اور ہم مکتب شہزادوں کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ زبان قلعہ معلّٰی سے نکل کر بستی حضرت نظام الدین جا بسی تھی۔ ہم سبقوں اور ہم مکتبوں کے ساتھ کو یہ چیلاں، دلّی کے ہزار ہا پریشان حال شہزادوں سے بھی ملنے جلنے کا موقع ملا کرتا تھا۔ اِس نے اُن کے دل میں شہزادوں کی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھر دی، دُکھا ہوا دل شہزادوں کے دُکھ سے تڑپ اُٹھا اور خواجہ صاحب کے قلم سے بارہ، تیرہ کتابیں، شہزادوں کے متعلق لکھوا گیا۔[۱]

---

[۱] شہزادوں سے ہمدردی کی بنیاد تین سال کی عمر میں پڑ گئی تھی۔ تین سال کی عمر میں خواجہ صاحب سخت بیمار ہوئے اور اُن کی والدہ نے اُنھیں ایک درویش کے پاس بھیجا جو درگاہ حضرت سلطان المشائخ میں رہتے تھے۔ یہ درویش مغل شہزادہ تھے اور بہادر شاہ بادشاہ کے قریبی عزیز تھے، درویش صاحب نے گلے میں نادعلی دبانی تعلیف[۲] پہنا

مولانا محمد اسمٰعیل کاندھلوی سے خواجہ صاحب نے ا۔ب سے لیکر جلالین اور مشکوٰۃ تک پڑھا۔ مولانا محمد اسمٰعیل کے انتقال کے بعد مولانا کے بڑے فرزند مولانا میاں محمد اُستاد رہے۔ مگر سُنن ابوداؤد اور ترمذی کے سبق دلی میں لئے۔ دلی کے اساتذہ مولوی عبدالعلی محدث۔ مولوی وصیت علی۔ مولوی حکیم رضی الحسن، اور مولوی حکیم الہٰ دین ہیں۔ پھر مولانا محمد اسمٰعیل کے چھوٹے فرزند مولانا محمد یحییٰ نے (جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد رشید تھے۔) گنگوہ کے مدرسہ رشیدیہ میں داخل کرادیا اور خواجہ صاحب نے وہاں ڈیڑھ سال قیام کیا۔

تہیدستی

خواجہ صاحب کے والد جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، تعلیم یافتہ نہیں تھے، فقط حافظ قرآن تھے۔ اُن کا گزارہ اور پیرزادوں کی طرح درگاہ کے چڑھاووں پر تھا مزار حضرت سلطان المشائخ کے پائیں مقفل صندوقچی رکھی رہتی ہے۔ زائرین حسب توفیق اُس میں کچھ ڈال دیتے ہیں۔ روز شام کو صندوقچی کھُلتی ہے اور جمع شدہ روپیہ بٹ جاتا ہے۔ بس اسی آمدنی سے پیرزادوں کے خرچ چلتے ہیں۔ زیارت کے وقت

(بقیہ حاشیہ صہ ۲۸) کا نقش ڈلوادیا۔ والدہ کہنے لگیں میرے بچّی کیواسطے ہندوستان کے بادشاہ نے شاد علی کا نقش دیا ہے۔ (بچّی خواجہ صاحب کا پیار کا نام تھا) بادشاہ کے لفظ پر والدہ کے آنسو نکل آئے۔ خواجہ صاحب نے پوچھا۔ اَماں روتی کیوں ہو۔ فرمایا۔ بیٹا! اب وہ بادشاہ نہیں ہیں۔ انگریزوں نے بادشاہت چھین لی۔ خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ اس واقعہ سے شہزادوں کی ہمدردی کا بیج بویا گیا تھا مکتب میں داخل ہوتے وقت خواجہ صاحب کی عمر پانچ سال تھی، ۷ سال کی عمر میں خواجہ صاحب ہم سبق شہزادوں کو مرد بنایا کرتے تھے اور شہزادوں سے میواتی بڑھئی اور قصائی ہم سبقوں پر حکومت کرایا کرتے تھے۔

زائر کے چڑھا جائے تو زیادہ رقم ہاتھ لگ سکتی ہے لیکن وہ صرف جھپٹنے والے کی ہوتی ہے صندوقچی میں نہیں پڑتی۔ خواجہ صاحب کے والد جھپٹنے کے خلاف تھے، اور آمدنی کی کمی جلد سازی کے ذریعہ پوری کرتے تھے۔ دلی کے مطابع اور تاجرانِ کتب سے کتابیں لے آتے تھے اور جلدیں باندھ کر پہنچا دیتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ محنت کی کمائی درگاہ کے چڑھاووں سے ہزار درجہ بہتر ہے، خواجہ صاحب نے والد کا عمل دیکھا اور قول سُنا۔ پھر بارہ سال کی عمر میں یتیم ہو جانے کا اثر یہ پڑا کہ اُن کا چڑھاوے کا حصہ بھی دوسرے کھا جاتے تھے۔ نیز اُنھیں مزار کے نزدیک نہیں پھٹکنے دیا جاتا تھا۔ مبادا کسی کا دل پسیج جائے اور بڑوں کو ملتی ہوئی رقم بچے کو مل جائے۔

ایک دفعہ خواجہ صاحب پیادہ پا بستی حضرت نظام الدین سے دلی آ رہے تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ راستہ میں نواب غلام نصیر الدین خاں (عرف نواب بدھن) رئیس شیخ پورہ برناوہ نے دیکھا کہ شریف شکل کا لڑکا ہے، وہ ہاتھی پر سوار تھے ہاتھی رکوا کر پوچھا۔ تم کون ہو اور کہاں جاؤ گے۔ خواجہ صاحب نے کہا ہم صاحب زادے ہیں اور دلی جا رہے ہیں۔ پیرزادوں کو عموماً صاحبزادہ کہا جاتا ہے۔ نواب صاحب سمجھ گئے۔ فوراً ساتھ بٹھا لیا۔ خواجہ صاحب کے خاک آلودہ پیروں کی خاک ہاتھوں سے صاف کی اور ہاتھ اپنے چہرے اور ڈاڑھی پر پھیرے اور محل سرا نواب بدھن پہنچ فرمایا۔ یہ ہاتھی آپ کی نذر ہے۔ آپ لے جائیے۔ فیل بان کو حکم دیا کہ صاحبزادہ صاحب جہاں جہاں جائیں وہاں ہو کر ہاتھی ان کے گھر چھوڑ آؤ۔ بڑے پیرزادوں نے فوراً ہاتھی پر قبضہ جما یا اور ہاتھی کے کوڑے کر کے قیمت تقسیم کر لی۔ کہا نواب صاحب کی نذر شخص واحد کے لئے نہیں ہو سکتی سب کے لئے ہے نواب صاحب خوش عقیدہ اور سراپا نیاز انسان تھے۔ اُنھیں چھوٹے سے

پیرزادہ کا اتنا خیال تھا تو بڑے بڑے پیرزادوں کے آگے کیا بولتے۔

غرضیکہ اللہ میاں خواجہ صاحب سے عجیب و غریب تجربے کرا رہے تھے، خواجہ صاحب شکنجوں میں سے نکل رہے تھے۔ والد کی نصیحت، بلکہ وصیت بار بار یاد آتی تھی کہ "درگاہ کے چڑھاووں سے محنت کی کمائی بہتر ہے۔" ـــــ اور سوچا کرتے تھے کہ محنت کا کونسا کام اختیار کروں؟

محنت سے خواجہ صاحب کو کبھی عار نہیں آئی۔ انتہائی عروج کے زمانہ میں وہ اپنے دفتری اور چپراسی کا ہاتھ بٹانے بیٹھ جاتے تھے۔

امریکہ کا بہت کامیاب اور مشہور رسالہ ہے، جوگرفیکل میگزین۔ پچھلے دنوں اُس کے ایڈیٹر نے تجزیہ لکھا تھا کہ پچاس سال قبل جب میگزین جاری کیا گیا ہے تو میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ ملازم یا مزدور سے میگزین ڈاکخانہ بھجواتا۔ بوری میں بھر کر میگزین ڈاکخانہ خود لے جاتا تھا۔ اب میگزین کی اشاعت کا یہ حال ہے کہ میگزین الماریوں میں چُنا جائے اور الماریاں برابر، برابر رکھی جائیں تو بارہ میل تک الماریاں ہی الماریاں نظر آئیں گی۔

جوگرفیکل میگزین کے ایڈیٹر کا بیان پڑھ کر مجھے خواجہ صاحب کی بات یاد آگئی نظام المشائخ بھی جوگرفیکل میگزین کا ہم سن ہے۔ جولائی ۱۹۰۹ء میں جاری ہوا تھا۔ ہمیں ملازم میسّر تھا۔ لیکن اتفاق سے وہ کہیں چلا گیا اور دیر تک نہیں پلٹا۔ نظام المشائخ کے پوسٹ کرنے کی تاریخ تھی۔ پوسٹ آفس کا وقت تنگ ہو رہا تھا، یہ دیکھ کر خواجہ صاحب نے پلنگ کی چادر میں نظام المشائخ باندھا اور دو تین پھیرے کرکے ڈاک خانہ پہنچا دیا۔

یہ ۱۹۰۹ء کی بات ہے، جبکہ خواجہ صاحب کی حیثیت خوب نمایاں ہو چکی تھی۔ ۱۹۰۳ء میں خواجہ صاحب کتابیں اور عمارات کے فوٹو پھیری پھر کر

بیچتے تھے۔ دربار ۱۹۰۳ء کے موقع پر بستی حضرت نظام الدین سے قریباً نو دس میل دور، جہاں درباریوں کے خیمے لگائے گئے تھے، وہاں بیس سیر کا بوجھ سر پر رکھ کر پہنچتے تھے، خیموں میں جاتے تھے اور کتابیں اور عمارات کے فوٹو دکھاتے تھے۔ کسی نے دریافت کیا کہاں کے رہنے والے ہو، خواجہ صاحب نے فرمایا بستی حضرت حضرت نظام الدین میں رہتا ہوں۔ دریافت کنندہ نے کہا خواجہ حسن نظامی بھی تو وہیں رہتے ہیں۔ ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا، درگاہ شریف میں حضرت امیر خسروؒ کے مزار کے سامنے حسن نظامی کا حجرہ ہے۔ فلاں۔ فلاں وقت ملاقات ہو سکے گی۔

دوسرے دن وہ صاحب درگاہ شریف حاضر ہوئے اور خواجہ صاحب کے حجرہ میں گئے۔ خواجہ صاحب موجود تھے۔ اُن صاحب کی حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ بے اختیار زبان سے نکلا، آپ وہی خواجہ حسن نظامی ہیں جن کے مضامین اخباروں میں چھپتے ہیں؟ بڑا افسوس ہے کہ آپ جیسے انسان کو اتنا بوجھ اُٹھا کر کوسوں کی منزل طے کرنی پڑتی ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا افسوس نہ کیجئے خوش ہوجیے کہ میں اور پیرزادوں کی طرح بھیک نہیں مانگتا۔ اپنی روزی محنت مزدوری کر کے حاصل کرتا ہوں۔

پھیری پھر کر کتابیں اور عمارات کے فوٹو بیچنے کا شغل اختیار کرنے سے پہلے خواجہ صاحب نے یہاں تک کیا ہے کہ درگاہ کے دروازے پر اُس جگہ بیٹھ جاتے تھے جہاں زائرین جوتے اُتارتے ہیں اور جوتوں کی حفاظت کر کے پیسے کماتے تھے، نیز بلند چھتوں اور گنبدوں پر سے درگاہ کی باولی میں کودتے تھے اور پیسے لیتے تھے۔

جس زمانے میں خواجہ صاحب کا میرے ہاں قیام تھا (۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء)

راجہ نوشاد علی، اودھ کے مشہور اور ذی علم رئیس دلی آئے، انھیں میر باقر علی کی داستان سُننے کا شوق تھا۔ کہا کرتے تھے کہ لکھنؤ کی داستان گوئی مٹ چکی، دلی کی داستان گوئی میر باقر علی کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ دلی اکثر تشریف لاتے تھے اور میرے ہاں داستان کی محفل جمتی تھی اِس دفعہ طے پایا کہ ہمایوں کے مقبرے میں داستان سُنیں گے۔

خواجہ صاحب۔ راجہ صاحب۔ میر صاحب اور میں، چار آدمی دلی سے مقبرہ ہمایوں چلے۔ کیسے ممکن تھا کہ مقبرہ ہمایوں جائیں اور درگاہ حضرت سلطان المشائخ نہ جائیں۔ چنانچہ درگاہ شریف میں بھی حاضری دی اور فاتحہ خوانی کی۔ فاتحہ پڑھکر باہر نکلے تو خواجہ صاحب نے بٹوے میں ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ میں بجائے پیسے یا اکنی دوانی کے روپیہ آگیا۔ خواجہ صاحب نے جوتوں کی حفاظت کرنے والے کو دیدیا اور راجہ صاحب سے فرمایا۔ راجہ صاحب! میں خود بھی یہاں بیٹھا ہوں مجھے ایک پیسے کو زیادہ معاوضہ کبھی نہیں ملا۔ اللہ کا شکر ہے آج اُس نے مجھ سے ایک روپیہ دلوایا۔ جوتوں کی حفاظت بستی کے کرمین کیا کرتے ہیں یہ غریب ایک پیسے ہی میں خوش ہو جاتے ہیں۔ میں بھی ایک پیسہ لے کر خوش ہو جاتا تھا۔ ایک پیسے سے زیادہ لینے کی ہمت ہی نہیں تھی۔

ایک دن ایک ہندو زیارت کے لئے آیا۔ اُس نے مجھ سے پُوچھا۔ جوتوں کی حفاظت کا کیا دوں؟ میں نے کہا۔ جو آپ کا جی چاہے، وہ بولا نہیں، زیادہ سے زیادہ مانگو! میں نے کہا، چار پیسے دے دیجئے۔ ہندو ہنسا اور چار پیسے دے کر چلا گیا اور خاندان والوں نے طعنے دیئے کہ چار پیسے سے زیادہ نہ مانگے گئے۔ تیرے باپ دادا بھی کم حوصلہ اور چھوٹے دل کے تھے۔

لہ اس واقعہ پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ خواجہ صاحب بچپن میں (باقی ص۳۳ پر)

غرض کہ خواجہ صاحب کو محنت مزدوری کرنے سے عار نہیں آتی تھی اور خواجہ صاحب محنت مزدوری کا ذکر دورِ عروج میں بے تکلف کر دیتے تھے۔

بقول مرزا فرحت اللہ بیگ "عمر بھر میں صرف دو آدمی ایسے دیکھے ہیں ایک خواجہ صاحب۔ دوسرے شمس العلماء خان بہادر مولوی نذیر احمد، ال۔ ال۔ ڈی مولوی صاحب بھی اپنی سابقہ حالت کے اظہار سے نہیں گھبراتے تھے"۔

۱۹۰۸-۱۹۱۳ کے درمیان خواجہ صاحب کا عروج شروع ہو گیا تھا شاہ سلیمان پھلواروی علامہ شبلی نعمانی۔ علامہ اقبال۔ مولانا ابوالکلام۔ مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا عبد الحلیم شرر۔ میر غلام بھیک نیرنگ کے درجہ کے حضرات اُن سے ملنے بار، بار تشریف لاتے تھے اور نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک بار، بار انھیں علی گڑھ بلاتے تھے [1]

(بقیہ حاشیہ صـ۳۳) دو آنی اُچھالتے چلے جا رہے تھے، کسی چالاک فقیر کو چمکتا ہوا پیسہ اسی وقت خیرات ملا تھا۔ فقیر نے کہا، کالا پیسہ مجھے دے دو۔ میں تمھیں چمکدار پیسہ دیتا ہوں۔ خواجہ صاحب نے خوشی خوشی میلی دو آنی فقیر کے حوالے کر دی اور چمکدار پیسہ لے لیا۔

[1] خواجہ صاحب کے سفرنامہ ہندوستان (مطبوعہ ۱۹۲۲ء) سے پتہ چلتا ہے کہ نواب محسن الملک کے ساتھ اور پہلے کے تعلقات تھے۔ ۱۹۰۷ء میں خواجہ صاحب بمبئی پہنچے ہیں تو نواب صاحب وہاں مقیم تھے۔ نواب صاحب کی ملاقاتوں، اور مداراتوں کا بار بار ذکر آیا ہے۔ آج نواب صاحب فلاں سے ملانے لے گئے۔ کل نواب صاحب نے فلاں مقام کی سیر کرائی۔ وہیں مشہور ڈرامہ نویس آغا حشر کاشمیری کا بھی تذکرہ ہے۔ خواجہ صاحب اُن کے پاس جاتے تھے (باقی صـ۳۵)

حاشیہ: وہ خواجہ صاحب کے پاس آتے تھے اور تھیٹر بیجا بیجا کر اپنے ڈرامے دکھاتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں خواجہ صاحب نے بمبئی کے جلسوں میں تقریریں کی ہیں، اور جلسوں کی صدارتیں فرمائی ہیں۔ بمبئی میں شیخ عبدالقادر کا خط ملا۔

بمبئی سے نواب مزمل اللہ خاں اور نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو علیگڑھ خط لکھے۔ مولوی عزیز مرزا اور نواب علی حسن خاں کو لکھنؤ اور شیخ محمد اقبال کو کیمبرج۔ علامہ اقبال اور سر عبدالقادر سے تو خیر ۱۹۰۳ء سے مراسم تھے ہی، اور دوں سے بھی مراسم نکل آئے

ایک جگہ نواب محسن الملک کے آپریشن کا حال ہے۔ نواب صاحب کے سر میں پھوڑا ہو گیا تھا۔ اس کا آپریشن کراتے وقت خواجہ صاحب موجود تھے۔ مجھے خیال پڑتا ہے غالباً اسی آپریشن کی بابت خواجہ صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر بے ہوش کر کے آپریشن کرنا چاہتا تھا۔ نواب صاحب نے کہا نہیں ویسے ہی سر کاٹ لیجیے اور مسکرا کر خواجہ صاحب سے بولے۔ بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے۔ جب تک ہم ہندوؤں کا ساتھ نہیں دیں گے، ہندو انگریزوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور پھر یہ پڑھا ؎

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

مسٹر محمد علی (یعنی مولانا محمد علی، رئیس الاحرار) سے بھی نواب محسن الملک نے تعارف کرایا تھا۔

۱۹۰۸ء کی تحریر کا نمونہ بھی دیکھ لیجیے۔ بمبئی سے جہاز میں سومنات جا رہے ہیں ارشاد ہوتا ہے۔ "ایک بجے آنکھ کھل گئی۔ مطلع صاف تھا، اور پندرھویں رات کا چاند چمکتا، دمکتا، چاندنی کے جہاز میں سوار ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اللہ تیری شان پانی کے ہچکولوں میں چاند کے نور کا غوطہ کھانا اور تاریک سطح کو منور کر کے (باقی ص ۳۶)

خواجہ صاحب تادمِ آخر یہ قصے بیان فرماتے رہے اور کہتے رہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا نفس اپنی اصلیت کو بھول جائے۔

خواجہ صاحب محنت مزدوری کرنے سے نہیں شرماتے تھے۔ اُن کے نزدیک الحاف اور جھپٹنا معیوب تھا۔ لوگ بغیر جھپٹے، عزت اور خودداری نہ کھوا کر کچھ پیش کردیتے تھے تو اُس سے انکار نہیں ہوتا تھا۔ تحفے اور نذرانے تو اُن کے پاس تمام عمر آئے وہ صرف یہ فقرہ زبان پر لانے سے شرماتے تھے کہ "نذر اس غلہ میں ڈال دیجیے" زائر کو جتانا کہ تجھے نذر دینی ہے، انھیں گوارا نہیں تھا۔

دورِ افلاس میں راجہ نوشاد علی خاں۔ نواب غلام نصیر الدین خاں، عرف نواب بڈھن۔ نواب محمد مزمل اللہ خاں، رئیس بھیکم پور، شیخ غلام محمد، مالک اخبار وکیل امرتسر، شہزادہ مرزا امیر الملک عرف مرزا بلاقی اور منشی غلام نظام الدین عرف خاکسار عالم نے اکثر نذریں دیں اور خواجہ صاحب نے قبول کیں۔

ایک انگریز[1] سال کے سال ہندوستان کا پھیرا کیا کرتے تھے۔ سب سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵)

باہر نکلنا وجد میں لانے والا سین تھا۔ جدھر نظر جاتی تھی، ہلکی اور ٹھنڈی روشنی پانی کی موجوں میں جھلملاتی معلوم ہوتی تھی۔ سمندر کا ہولناک کالا دیو چاندنی کی نورانی پری کو آغوش میں لینا چاہتا تھا، اور وہ پھڑک کر بھاگتی اور بدن چُراتی تھی۔ اس پر سمندر کے غیظ و غضب کے حملے اور مدہوشانہ جوش کے جملے بس دیکھنے کے قابل تھے۔"

سفرنامہ ہندوستان، روزنامچے کی شکل میں ہے۔ جگہ جگہ بیان کرتے ہیں آج اس عنوان سے فلاں اخبار کو مضمون بھیجا۔ اب بس عنوان باقی ہیں مضمون نابود ہو گئے۔ اس قسم کے عنوان ہیں۔ علی جی کے مندر۔ چوپاٹی کی سیر۔

[1] جنرل ڈکسن ان کا نام تھا۔ میں نے انھیں سالہا سال آتے دیکھا ہو (باقی صفحہ ۳۷)

زیادہ رقم وہ دے جاتے تھے۔

شادی

مدرسہ رشیدیہ گنگوہ سے فراغت پاتے ہی خواجہ صاحب کی شادی حقیقی چچا سید معشوق علی کی بیٹی حبیب بانو سے کر دی گئی تھی۔ بیوی نے بھی قدیم بیویوں کا کیرکٹر پیش کیا اور صبر کا کمال دکھادیا۔ جو شوہر کا حال وہ بیوی کا حال۔ مل گیا تو کھالیا، ورنہ فاقہ۔ بیوی کی زبان پر شوہر کی شکایت نہیں، اور شوہر کی زبان پر قسمت کا گلہ نہیں۔ کیا مجال ہے، دونوں ہمرازوں میں سے کوئی راز فاش کر دے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶) یہ باضابطہ مسلمان تو نہیں ہوئے تھے لیکن اسلام اور تصوف کی معلومات کا شوق تھا۔ مصر کے مفتی محمد عبدہ کا اور اکثر علماء سے دوستی تھی، خواجہ صاحب کو پیر بنا لیا تھا، بلکہ خواجہ صاحب کے پہلے مرید یہی تھے۔

جنرل ڈکسن کے آنے سے خواجہ صاحب کو کئی قسم کی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی کہتا تھا "حسن نظامی کرسٹان ہوگیا ہے"۔ کوئی کہتا تھا "جنرل ڈکسن جاسوس ہے، مسلمانوں کے بھید لیتا ہے"۔

لیکن خواجہ صاحب جنرل ڈکسن کے احسانات یاد کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اللہ نے اُن کے ذریعہ میری بڑی مدد فرمائی۔ وہ دورِ دشوار کے غیبی فرشتے تھے۔

عروج کے زمانہ میں ایک روسی بھی خواجہ صاحب کا مرید ہوا تھا، اور خواجہ صاحب کے پاس رہ کر تصوف کی تعلیم حاصل کرنی چاہتا تھا مگر دوسری بڑی اور عالمگیر لڑائی کے سبب مسٹر ہیلی چیف کمشنر دہلی نے (جو اب لارڈ ہیلی ہیں) اُسے رہنے نہیں دیا۔

میرے مراسم خواجہ صاحب سے سنہ ۱۹۱۰ء میں شروع ہوئے تھے اُسوقت تک خواجہ صاحب پر اور خواجہ صاحب کی اہلیہ محترمہ پر کبھی کبھی فاقہ گزر جاتا تھا لیکن روزانہ گھنٹوں ساتھ رہنے کے باوجود خواجہ صاحب نے اس راز کی ہوا نہیں دی فاقہ کا اثر چہرہ سے ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہ ساری باتیں اُنھوں نے دورِ عروج میں بیان کیں۔ بڑے حوصلے کے انسان تھے۔ فاقوں میں اُنھیں مضامین سُوجھتے تھے۔ اسی دورِ افلاس میں قومی جلسوں کی شرکت کے لئے دور، دور پہنچ جاتے تھے

میری ملاقات

علی گڑھ کالج سے خواجہ صاحب کو قلبی لگاؤ تھا۔[۱] مجھے اُن کی طرف کشش اول اول علی گڑھ کالج ہی کے سلسلہ میں ہوئی تھی۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں امیر حبیب اللہ خاں، شاہ افغانستان، لارڈ منٹو، وائسرائے ہند کے مہمان بن کر تشریف لائے محسن الملک نواب مہدی علی خاں علی گڑھ کالج کے سکریٹری تھے۔ اُنھوں نے امیر صاحب سے درخواست کی کہ علی گڑھ کالج میں قدم رنجہ فرمایئے۔ امیر صاحب علیگڑھ کالج سے بدگمان تھے اور نواب صاحب اس بات سے واقف۔ نواب صاحب نے کوشش کی کہ علماء و مشائخ کا اجتماع کر کے امیر صاحب کا خیال بدلیں چنانچہ میں نے اخباروں میں پڑھا کہ اُن علماء و مشائخ میں "مولانا سید حسن نظامی خواجہ زادہ حضرت سلطان نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہی" بھی ہیں۔ نام سے واقف تھا۔ لیکن، اس خبر نے ملاقات کا شائق کر دیا۔

۱۔ سنہ ۱۹۳۲ء تک خواجہ صاحب مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے۔

اشتیاق ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ ملاقات ۱۹۰۷ء میں۔ تعلقات ۱۹۰۸ء سے بڑھے۔
خیر ذکر خواجہ صاحب کے حوصلے کا تھا۔ اسی دورِ افلاس میں ۱۹۰۵ء اور
۱۹۰۶ء کے درمیان ہندو تیرتھ گاہوں کا سفر کر ڈالا۔ گیروا لمبا کرتہ پہنا۔ ہاتھ
میں تونبی لی بغل میں کمبل دبایا، غرض سادھوؤں کا روپ بھر، متھرا جا پہنچے،
پھر متھرا سے اجودھیا۔ بنارس۔ گیا۔ بودھ گیا ہردوار اور رکھی کیش گئے مندر
دیکھے اور فقراء سے ملے۔

واپس آکر "تیرتھ یاترا" کتاب لکھی۔ یہ کتاب چھپنے نہ پائی تھی کہ اس سفر پر
ہی اہلِ درگاہ نے ہنگامہ برپا کر دیا مولویوں سے کافر۔ ہندو، بت پرست تک کہوا دیا
کتاب کہیں چھپ جاتی تو قیامت آجاتی۔ خواجہ صاحب نے اُسے چھاپنا مناسب
نہیں سمجھا۔ وہ خواجہ صاحب کی پہلی تصنیف تھی۔

مخالفت

بچپن میں اہلِ درگاہ اور اہلِ خاندان کا جو برتاؤ رہا وہ ماں، باپ کے
مر جانے کے بعد رہا ہی کرتا ہے، وہ عجوبہ نہیں تھا۔ بڑے بھائی بہت خیال
رکھتے تھے۔ لیکن ماں۔ باپ، ماں باپ ہوتے ہیں۔ پھر بھائی کی اپنی بیوی سے
ذرا کم بنتی تھی۔ اس کا خمیازہ بھی خواجہ صاحب کو بھگتنا پڑتا تھا۔ نیز خواجہ صاحب
کی خوب صورتی نے بھائی کا وہم حد سے زیادہ بڑھا دیا تھا۔ خواجہ صاحب اُن کا کہنا
مانتے تھے، جس سے ملنے کو بھائی منع کر دیتے تھے اُس سے نہیں ملتے تھے۔ تاہم
دو آدمیوں پر خواجہ صاحب کو کامل بھروسہ تھا، اُن سے ملنا نہیں چھوڑتے تھے[۱]

---

[۱] ایک حافظ عبد المغنی، تاجر جفت، دوسرے منشی غلام نظام الدین دہلوی باقی صفحہ

اس لیے بھائی جتنی سرپرستی کر سکتے تھے کرتے تھے۔

بہرحال زمانہ یتیمی میں خاندان کی بے رُخی عجیب شے نہیں ہے، مگر جب خواجہ صاحب جوان ہو گئے اور تعلیم سے فراغت پا کر اُنھوں نے درگاہ کی بے عنوانیوں، مثلاً مزار حضرت سلطان المشائخ کے پائیں زنانِ بازاری کے گانے کودنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو بے رُخی مخالفت سے بدل گئی۔ اور جب خواجہ صاحب تیرتھ گاہوں کے سفر سے لوٹے تو مخالفت کے لیے اہلِ درگاہ کو مواد مل گیا۔

(بقیہ حاشیہ ص۳۹) خاکسارِ عالم، تاجر کتب۔ حافظ عبدالغنی کو خواجہ صاحب کے ساتھ دعوےٰ عشق تھا اور وہ واقعی عاشق نکلے۔ ایک دن بھائی کی روک ٹوک پر خواجہ صاحب کے سامنے اُنھوں نے بھائی کو بُرا کہا، خواجہ صاحب نے فرمایا۔ بھائی میرے خیرخواہ ہیں۔ اُن کی احتیاط حق بجانب ہے۔ حافظ صاحب بولے میاں! محبت بڑی چیز ہے۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا۔ میں محبت سے واقف نہیں ہوں اور نہ مجھے اپنی تعلیمی مصروفیتوں میں محبت پر غور کرنے کی فرصت ہے۔ حافظ صاحب اس جواب سے مشتعل ہو کر گھر چلے گئے اور تیزاب پی کر مر گئے۔ اُن کی قبر درگاہ میں لنگرخانہ کے پاس ہے۔

منشی غلام نظام الدین خاکسارِ عالم وہ بزرگ ہیں جن کا خواجہ صاحب کو خواجہ صاحب بنانے میں بڑا حصہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے خواجہ صاحب کو ہر طرح کی مدد دلوائی۔ وہ نہ ہوتے تو شاید خواجہ صاحب خواجہ صاحب نہ ہوتے خواجہ صاحب نے چودہ پندرہ برس کی عمر میں یہ رائے قائم کی کہ حاجی عبدالغنی اور خاکسار صاحب دوسروں سے مختلف ہیں، اس سے خواجہ صاحب کی فطری مردم شناسی کا پتہ چلتا ہے۔ (باقی حاشیہ ص۴۱ پر)

اہلِ درگاہ نے خواجہ صاحب کے خلاف محضر تیار کیا، جس پر بڑے بھائی سید حسن علی۔ ماموں زاد بھائی سید محمد صادق شہید۔ سید صمصام الدین۔ سید واجد علی۔ سید اکبر علی کے سوا کل صاحبزادگان کے دستخط ہوئے۔ پھر یہ جم غفیر شہر کے علماء و مشائخ سے محضر پر دستخط کراتا پھرا۔ شہر میں مرزا حیرت اس جم غفیر کے مُشیر تھے۔ شہر کا ہر مولوی اور پیر، جم غفیر کی خاطر دستخط کر دیتا تھا، لیکن حضرت شاہ ابوالخیرؒ اور حضرت مولانا محمد عمر اخوندجی نے انکار کر دیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰) خاکسار صاحب سے خواجہ صاحب کے اُن کی رحلت تک تعلقات رہے۔ اب بھی خاکسار صاحب خواجہ صاحب کے برابر مدفون ہیں۔ بیچ میں خواجہ صاحب کا مزار ہے۔ اُس کے ایک جانب خواجہ صاحب کے ماموں زاد بھائی اور خسر (خواجہ بانو کے والد) سید محمد صادق شہید اور دوسری جانب خاکسار صاحب۔

خواجہ صاحب کی تعلیم اور خواجہ صاحب کا کاروبار، سب خاکسار صاحب کے رہینِ منت ہیں۔ خاکسار صاحب نے تعلیم کا شوق مرنے نہیں دیا۔ خاکسار کے اصرار پر خواجہ صاحب گنگوہ پڑھنے گئے۔ وہاں کا خرچ بڑے بھائی اٹھاتے رہے۔ مضامین اور کتابیں لکھنے کی رغبت بھی خاکسار صاحب کی پیدا کی ہوئی تھی۔ بیچنے کے لئے کتابیں بھی اُن کی دکان سے ملتی تھیں۔ عمارات کے فوٹو حاجی احمد مرزا (ایچ۔ اے۔ مرزا مشہور فوٹو گرافر) دیدیتے تھے۔

خاکسار صاحب کا دلی کے باوضع لوگوں میں شمار تھا۔ درگاہ حضرت سلطان المشائخ میں بدھ کی حاضری اِن کی اور ایک ہندو کی تھی، لالہ پیارے لال جوہری، اُن کی ضرب المثل تھی۔ لالہ صاحب کو تو درگاہ والے (باقی صفحہ ۴۲ پر)

حلقہ نظام المشائخ

۱۹۰۸ء میں خواجہ صاحب نے حلقہ نظام المشائخ قائم کیا۔ مشائخ کے نظام کا حلقہ۔

ہمایوں کے مقبرہ میں شاہ زادہ دارا شکوہ کی قبر کے پاس حلقہ نظام المشائخ کے افتتاحی جلسے کی دعوت دی گئی تھی اور فقط چھ آدمی اس میں شریک ہوئے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱) بُدھ والا لالہ کہتے تھے۔

خاکسار کا دستور تھا کہ پہلے درگاہ کی باولی میں غسل کرتے، پھر اندر آکر فاتحہ پڑھتے۔ ایک بدھ کو اُن کے لڑکے کا انتقال ہو گیا، مگر اُنھوں نے درگاہ کی حاضری ناغہ نہیں کی۔

چاندنی چوک میں خاکسار صاحب کی دکان تھی۔ آخر میں دریبہ آگئے تھے۔ چاندنی چوک اور دریبہ کے امیر امیر ہندو اُن سے مشورہ لینے آتے تھے، خواجہ صاحب نے خاکسار صاحب کے مشوروں کو عروج کے زمانے میں بھی توجہ سے سُنا۔

خاکسار صاحب خواجہ صاحب کے ہاں تشریف لاتے تھے تو خواجہ صاحب کی مجلس میں ممتاز جگہ نہیں بیٹھے تھے۔ خواجہ صاحب سے اُنھوں نے اپنی عزت میں اضافہ نہیں کرایا نہ اپنے بچوں کو نوکریاں دلوائیں، لیکن خواجہ صاحب تنہا ہوتے یا خواجہ صاحب اُن کی دُکان پر جاتے تو تیوری چڑھا چڑھا کر کہتے تم نے فلاں بات نامناسب کی ہے۔ خواجہ صاحب چپ تھے۔ بالخصوص خاکسار صاحب کی دُکان کا پھیرا لازما کرتے تھے اور خاکسار صاحب خبر رکھتے تھے کہ خواجہ صاحب کیا کر رہے ہیں۔ بے لوث بے نیاز اور مخلص انسان تھے۔ (باقی صفحہ ۴۳ پر)

میں تھا۔ مرزا یعقوب بیگ نامی تھے (جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر ہیں) سید وحید الرحمن عرفانی تھے (جو میرٹھ کالج میں پروفیسر ہیں) ضیاء الدین احمد برنی تھے۔ قاضی لطیف الدین پیرزادہ درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی تھے اور علاء الدین نصیری، پیرزادہ درگاہ حضرت چراغ دہلی تھے۔ ساتویں خود خواجہ صاحب تھے۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۴۲) خاکسار صاحب نے خواجہ صاحب کو لڑکپن میں پہلی نصیحت یہ کی تھی کہ "میاں! پیرزادگی کا گھمنڈ بری چیز ہے جس نے اپنے آپ کو کچھ سمجھا وہ کچھ نہ رہا اور جس نے کچھ نہ سمجھا وہ سب کچھ ہو گیا۔ تمھیں دینی تعلیم مکمل کرنی چاہئے اور حضرت سلطان المشائخ کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔ اُن کا نقشِ قدم ترکِ طمع اور عبادت حق ہے۔ جو پیرزادے اپنے بڑوں کی کرامتیں سُنا سُنا کر روزی کماتے ہیں اُن کی زندگی قابلِ ملامت ہے۔ تم ایسے مت بننا۔ تم عمل کرو اور جن کے ناموں پر فخر کرتے ہو، اُن کے سے کام کرو۔ اُن کا کام نذریں مانگنا اور حسد و کینہ کی آگ میں جلنا اور نخش بکنا نہیں تھا۔ یہ آج کل کے پیرزادوں کا کام ہے"۔

یہ خاکسار صاحب کی خواجہ صاحب کو پہلی نصیحت تھی۔ اندازہ لگائیے کہ خواجہ صاحب کے بڑھاپے میں اُنھیں کیسی نصیحتیں کی جاتی ہوں گی۔ خاکسار صاحب نے خواجہ صاحب کو قدم قدم آگے بڑھایا۔ خواجہ صاحب کو قومی کاموں میں لگانے والے بھی خاکسار صاحب ہی تھے۔

خواجہ صاحب کے بڑے بھائی نے خواجہ صاحب کی دلجوئی اور دلداری میں کمی نہیں کی۔ بڑی محبت اور شفقت سے پالا۔ لیکن حافظ عبد المغنی اور خاکسار صاحب کے سلسلے میں اُن کا وہم خواجہ صاحب کے لئے سخت تکلیف دہ تھا (باقی صفحہ ۴۴ پر)

درگاہ حضرت سلطان المشائخ کا کوئی پیرزادہ نہیں آیا۔ شہر کے علماء و مشائخ میں سے کسی نے شرکت نہیں کی۔ لیکن سات آدمیوں کے جلسہ نے ملک کی قریباً ہر درگاہ میں ہلچل پیدا کر دی۔ حلقہ نظام المشائخ تنہا درگاہ حضرت سلطان المشائخ کی اصلاح کے لئے نہیں تھا، تمام درگاہوں کی اصلاح کے لیے تھا۔ درگاہ حضرت سلطان المشائخ کے پیرزادوں نے درگاہ درگاہ جا کر پروپیگنڈا کیا کہ حسن نظامی گنگوہ میں پڑھکر وہابی ہو گیا ہے، اسے اُگنے دیا تو ہم سب کو تباہ کر دے گا۔

لیکن اِدھر درگاہوں میں اختلاف ہو رہا تھا اُدھر کالجوں میں خواجہ صاحب سے دلچسپی بڑھ رہی تھی۔

انگریزی تعلیم کے مسلمان حامی بھی علماء و مشائخ سے بے پرواہ نہیں ہوئے تھے، اور ایسے علماء و مشائخ کو ڈھونڈتے تھے جو اُن سے تعاون کر سکیں۔ خواجہ صاحب میں اُنھوں نے اِس کی اہلیت پائی اور سر آنکھوں پر بٹھا لیا۔ اخبارات بھی خواجہ صاحب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳) اتنا تکلیف دہ کہ خواجہ صاحب والدہ کی قبر سے لپٹ لپٹ کر روتے تھے۔

اخباروں میں مضامین لکھنے پر بھی بڑے بھائی صاحب بگڑتے تھے اور کہتے تھے بگڑ جائے گا۔

خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ والدین کے انتقال کے بعد سے شادی ہونے تک زندگی ایسی پُر الم اور درد انگیز تھی کہ اللہ دشمن کی ویسی نہ کرے۔

خواجہ صاحب اولاد اور ماتحت بچّوں کی اس قدر شدید نگرانی کے خلاف تھے۔ اس قدر شدید نگرانی سے بچوں کو بڑوں سے ضد ہو جاتی ہے، نگرانی میں غفلت بھی خطرناک ہے اور سختی بھی خطرناک ہے۔ سختی سے بھی بچے بے راہ ہو جاتے ہیں۔ نرمی اور حکمت عملی سے سمجھانا چاہیئے۔

کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اخبارات نے حلقہ نظام المشائخ کے مقاصد کو زور شور سے سراہا۔

رسالہ نظام المشائخ

جولائی ۱۹۰۹ء میں خود خواجہ صاحب نے حلقہ نظام المشائخ کے مقاصد کی تبلیغ کے لیئے رسالہ نظام المشائخ جاری کیا۔ خواجہ صاحب اُس کے ایڈیٹر تھے اور میں نائب ایڈیٹر۔

نظام المشائخ کا دفتر نواب بڈھن کے کمرے پر قائم ہوا تھا۔ یہ کمرہ کیا، عظیم الشان دیوان خانہ تھا۔ نیچے متعدد دُکانیں۔ اوپر کئی کمرے اور صحن۔ بگمہ کھلا تا صرف نواب بڈھن کا کمرہ تھا۔ برابر نواب بڈھن کی محل سرا تھی۔ وہی نواب بڈھن جنھوں نے خواجہ صاحب کے لڑکپن میں خواجہ صاحب کو ہاتھی نذر کیا تھا۔

ہاتھی کے واقعہ سے لے کر نواب صاحب کی رحلت تک خواجہ صاحب کی اور نواب صاحب کی نبھی۔ اوّل نواب صاحب خواجہ صاحب کے سرپرست رہے پھر خواجہ صاحب نواب صاحب کے سرپرست ہو گئے۔

نواب صاحب پُرانی طرز کے رئیس تھے۔ اُنھیں وہم تھا، کہ میرے پاخانہ کے لوٹے سے کوئی دوسرا وضو بھی کر یگا تو لوٹا خراب ہو جائے گا۔ حقہ پیتے تھے، کس کی مجال تھی کہ اُن کے حقہ کی نال کو منہ لگالے۔ لیکن یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ایک حقہ فقط اپنے آگے رکھیں اور ایک یا دو یا چار حقے دوسروں کے آگے رکھوا دیں، سب کے آگے ایک ایک حقہ ہونا چاہیئے۔ نواب صاحب کے ہاں سو حقے تھے اور اُسی شان کے تھے جس شان کا حقہ نواب صاحب کا تھا۔ کسی تقریب میں سو سے زیادہ حقہ پینے والے آجاتے تو پھر تو مجبوری تھی ورنہ ہر حقہ پینے والے کے آگے ایک حقہ

رکھا جاتا تھا۔

ان باتوں کا نتیجہ ظاہر ہے، آخر افلاس کا منہ دیکھنا پڑا۔

خواجہ صاحب کے اور نواب صاحب کے اس قسم کے تعلقات تھے کہ ایک دفعہ کچھ قانونی مجبوری تھی۔ نواب صاحب نے ۱۹۰۹ء میں، جبکہ نظام المشائخ کا دفتر اُن کے کمرے پر تھا) کمرے اور محل سرا کو خواجہ صاحب کے نام فرضی طور سے بیع کر دیا وہ قانونی مجبوری نکل گئی تو خواجہ صاحب نے کمرہ اور محل سرا نواب صاحب کو لوٹا دیے۔

نواب صاحب سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ حضرت سلطان المشائخ کا پیرزادہ اُن کی لاکھ سوا لاکھ روپے کی جائداد ہضم کر جائے گا۔ خواجہ صاحب نے بھی اپنے زمانۂ بے زری میں اس اعتماد کی لاج رکھی۔

نواب صاحب خواجہ صاحب کے خاندانی قبرستان میں مدفون ہیں۔ اس قبرستان میں، خاندان سے باہر کے آدمیوں میں مسٹر آصف علی۔ والدہ آصف علی اور نواب بُدھن وغیرہ دفن ہیں۔

چھ مہینے نظام المشائخ کا دفتر نواب بُدھن کے کمرے پر رہا، پھر میں دفتر اپنے ہاں کوچہ چیلان میں لے آیا۔ خواجہ صاحب بھی وہیں آگئے۔ نواب صاحب مرتے دم تک مجھ سے اور خواجہ صاحب سے ملتے رہے۔ ہم دونوں اُن کے ہاں جاتے تھے۔ وہ ہمارے ہاں تشریف لاتے تھے۔

اوپر میں نے لکھا ہے کہ خواجہ صاحب نواب صاحب کے سرپرست ہو گئے تھے اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ خواجہ صاحب نواب صاحب کو مالی امداد دیتے تھے نواب صاحب نے تو خواجہ صاحب کی مالی امداد کی تھی، لیکن نواب صاحب مالی امداد لینے والے آدمی نہیں تھے۔ وہ مرتے مرتے تانبے کے برتن بیچ بیچ کر مہمانوں کی مدارات کیا کرتے تھے۔

سرپرستی سے مراد یہ ہے کہ خواجہ صاحب کا اثر و رسوخ نواب صاحب کے کام آتا تھا۔ نواب صاحب کی مالی حالت بگڑتے ہی اُن کے اپنے اثر و رسوخ میں فرق پڑ گیا تھا اور خواجہ صاحب کا اثر و رسوخ نواب صاحب کی رحلت تک کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا نواب صاحب کا ساتھ صرف دو آدمیوں نے دیا۔ حکیم اجمل خاں نے اور خواجہ حسن نظامی نے۔

میرے اور خواجہ صاحب کے تعلقات

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے مجھے خواجہ صاحب سے ملنے کا خیال ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا۔ ملاقات ۱۹۰۸ء میں ۔ اور تعلقات نے ترقی کی ۱۹۰۹ء سے۔

ملاقات ہونے کا قصہ عجیب ہے۔ میں نے ایک رات خواب دیکھا کہ مکان کے صحن میں لیٹا ہوں۔ رات کا وقت ہے۔ یکایک چاند کے اندر سمندر نظر آنے لگا اور سمندر سے کوئی غوطہ خور سمندر کی چیزیں نکال کر زمین کی سمت چلا اور اترتے اترتے میرے گھر میں آ اترا۔

چند روز بعد میں چاندنی چوک سے گزر رہا تھا۔ کوتوالی کے قریب میرے ایک ہم محلہ شاعر محمد مرزا مشتاق کی دوکان تھی۔ وہاں ذرا کی ذرا ٹھیر اتنے میں مشتاق صاحب کی دکان کے برابر کی دوکان سے ایک صاحب اُٹھے اور مشتاق صاحب سے بات کرنے تشریف لائے غور جو کیا تو ہو بہو وہی غوطہ خور۔ مشتاق صاحب نے تعارف کرایا کہ آپ خواجہ حسن نظامی صاحب ہیں۔

خواجہ صاحب سیاہ سرج کا لمبا کرتہ اور سفید ڈبل زین کا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ گلے میں فلالین کا دوپونے دو گز کا لمبا رومال لٹک رہا تھا۔ سر پر پھندنے دار قرمزی رنگ کی ترکی ٹوپی۔ پیر میں سابر کے چمڑے کا فل بوٹ۔ از سرتاپا صاف ستھرے اور اُجلے۔ چہرہ مردانہ حسن کا نمونہ۔ اچھے خدوخال۔ اچھا رنگ۔ موزوں داڑھی۔ دانت

خوشنما اور پاکیزہ۔ آنکھیں غلافی اور دلوں کی تہہ میں اُتر جانیوالی۔ عینک لگی ہوئی۔
جسم نہایت نحیف، چہرے کی ضد۔ قد کی طوالت نے جسم کو اور بدنما کر دیا تھا لیکن کرتے کی طوالت نے جسم کی بدنمائی چھپائی تھی۔ خواجہ صاحب کا کُرتہ گویا خواجہ صاحب ہی کے لئے بنا تھا۔ خواجہ صاحب سے زیادہ کسی کے جسم پر نہیں پھبتا تھا۔
میں خواجہ صاحب کی شخصیت سے تو مرعوب تھا ہی، خواجہ صاحب کی صورت اور خواجہ صاحب کے لباس نے بھی مجھے متاثر کیا۔ پھر خواجہ صاحب کا توجہ کے ساتھ بات کرنا۔ خواجہ صاحب کی آنکھوں اور زبان، دونوں میں موہنی تھی۔
کُرتہ اپنے لئے خواجہ صاحب نے خود تجویز کیا تھا مگر بات کرنے کا ڈھنگ چہرے کی طرح خداداد تھا۔ خواجہ صاحب اُس وقت تیس سال کے تھے۔ مجھ سے صرف آٹھ، نو برس بڑے۔ اس عمر میں اتنی خوش اخلاقی اور بُردباری سے کون بات کرسکتا ہے۔ باتوں میں خشکی نام کو نہیں تھی لیکن باتوں میں ہلکا پن بھی نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک دلکش اور باوقار انسان سے ملا۔ مگر ملنے کا چور ہوں اور ملنے کی کوشش نہیں کی۔
ایک دن، غالباً مئی ۱۹۰۶ء میں، گھنٹہ گھر کے نیچے کھڑا تھا کہ خواجہ صاحب آ گئے۔ پوچھا۔ کچھ پریشان سے ہیں آپ آج۔ خیریت تو ہے۔ میں نے کہا ہاں خیریت ہے، میں انٹرنس کے امتحان میں فیل ہو گیا۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ پھر کیا ہوا۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ میں نے کہا تیسری دفعہ امتحان دیا تھا۔ تین دفعہ فیل ہو چکا ہوں۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ پاس ہو جاتے تو کیا کرتے؟۔ میں نے کہا انگلستان جاتا۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ انگلستان جا کر کیا کرتے۔ میں نے کہا بیرسٹر بنتا۔ (اُس زمانہ میں بیرسٹری کے لئے بی۔ اے کی قید نہیں تھی) خواجہ صاحب نے کہا "بیرسٹر مشو، چیزے

دیگر شو[1] آؤ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمھیں بیرسٹری سے بہتر کام بتاؤں گا۔ چنانچہ خواجہ صاحب مجھے گھنٹہ گھر سے جیتی قبر بازار لے گئے۔ جہاں حویلی اعظم خاں کے بالمقابل نواب بڈھن کا کمرہ تھا اور جہاں دلی میں خواجہ صاحب ٹھہرا کرتے تھے۔ بلکہ نواب صاحب نے کمرہ اور محل سرا خواجہ صاحب کی تحویل میں دے رکھے تھے[2]۔ نواب صاحب خود شیخوپورہ میں رہتے تھے۔ راستہ بھر اور نواب صاحب کے کمرہ پر پہنچ کر خواجہ صاحب نے ایسی دل نشین باتیں کیں کہ میں مطمئن ہی نہیں مسحور ہو گیا۔

اب خواجہ صاحب نے میرے ہاں اور میں نے خواجہ صاحب کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ خواجہ صاحب دن بھر دلی میں رہتے تھے۔ صاحبزادگان درگاہ سے دور شام کو بستی حضرت نظام الدین چلے جاتے تھے۔ بیوی اور چھوٹی سی بچی حور بانو کے پاس۔

---

[1] یہ ایک تاریخی فقرہ ہے۔ حضرت سلطان المشائخ تعلیم کی تکمیل کر چکے تو اُن کی والدہ نے فرمایا۔ حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کے پاس چلے جاؤ۔ وہ بادشاہ سے تمھیں دلی کی قضاۃ (ججی) دلوا دیں گے۔ دلی کے قاضی کا انتقال ہو گیا تھا اور قضاۃ خالی تھی۔ مگر حضرت شیخ نجیب الدین متوکل نے کہا "قاضی مشو، چیزے دیگر شو"۔ میرے بھائی تمھارے منتظر ہیں۔ اجودھن کا راستہ لو اور دیکھو، اللہ کیا کرتا ہے؛ بزرگ مذکور حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے حقیقی بھائی تھے۔ پاک پٹن کا نام اُس وقت اجودھن تھا۔

[2] سُنا ہے، انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد کسی نے اس کمرہ اور محل سرا کو نواب صاحب کے وارثاں سے خرید کر تجارتی کٹرہ بنا دیا ہے۔

ہم دونوں کی طبیعتیں یکساں نہیں تھیں۔ ہماری نشو و نما متضاد ماحول میں ہوئی تھی۔ ہمارا ذوق مختلف تھا۔ مجھ پر انگریزیت اور صاحبیت سوار۔ خواجہ صاحب مولویت اور خانقاہیت کے امتزاج سے سرشار میرا دماغ مستقبل کے تصور سے عاری۔ خواجہ صاحب کا دماغ اسکیمیں سوچنے کا بادشاہ۔ میں نوجوان اور خواجہ صاحب جوان۔ میں خام خواجہ صاحب پختہ، صرف ایک شے ہم میں مشترک تھی۔ ہم ایک دوسرے کے مخلص تھے اور ہم کو ایک دوسرے کے اخلاص کا یقین تھا۔ اتنا یقین کہ چودھویں صدی میں اُس کی مثال ملنی مشکل ہے خواجہ صاحب چودھویں صدی سے چار سال قبل کی پیدائش تھے (۱۲۹۶ھ)۔ میں چودھویں صدی کے ابتدائی چار سال کی پیدائش ہوں (۱۳۰۴ھ)۔

مولوی مقبول احمد سیوہاروی اور حکیم محمود علیخاں ماہر اکبرآبادی

سیوہارہ ضلع بجنور کے ایک صاحب مولوی مقبول احمد، مجھ سے بڑے اور خواجہ صاحب سے چھوٹے، خواجہ صاحب کے مُرید تھے۔ سیوہاروی صاحب تادم تحریر سیوہارہ میں موجود ہیں۔ خواجہ صاحب کے ہاں سب سے پہلے میں نے اُنھیں دیکھا خواجہ صاحب کے پاس رہتے تھے اور صرف مُرید نہیں تھے، خواجہ صاحب سے مضمون نویسی سیکھتے تھے۔ میں بھی لاہور کے روزانہ پیسہ اخبار کا مراسلہ نگار تھا، اور اپنے مراسلوں کو مضمون کہا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب نے ملاقات کے چندروز بعد سمجھایا کہ انھیں مضمون نہیں کہتے۔ مراسلہ کہتے ہیں۔ مضمون مقبول احمد لکھتے ہیں،

مولوی مقبول احمد نظامی سیوہاروی شنہ ۱۹۰۹ء یا شنہ ۱۹۰۸ء میں سیوہارہ چلے گئے، اور آگرہ کے محمود علی آئے، جو اب خاں صاحب حکیم محمود علی ماہر اکبرآبادی ہیں اور سال کا بڑا حصہ جدہ، مکہ اور مدینہ میں گزارتے ہیں۔

مولوی مقبول احمد نے خواجہ صاحب کی سی وضع بنالی تھی۔ حکیم محمود علی بھی لمبا کرتہ کبھی کبھار پہن لیتے تھے۔ حکیم صاحب نظام المشائخ کے ابتدائی زمانہ تک ٹھہرے نواب بدھن کے کمرہ تک۔ نظام المشائخ کا دفتر میرے مکان میں منتقل ہوا ہے تو وہ جاچکے تھے۔ نواب بدھن کے کمرہ کے دور میں خواجہ صاحب نے ڈھاکہ اور کلکتہ کا ایک سفر کیا تھا اس میں حکیم محمود علی خواجہ صاحب کے رفیق سفر تھے۔ یہ سفر خواجہ صاحب نے نواب سر سلیم اللہ خاں، نواب ڈھاکہ کی دعوت پر کیا تھا۔ خواجہ صاحب کو دلی کے طبیبوں اور ڈاکٹروں نے دق بتادی تھی۔ نواب سلیم اللہ خاں نے کہا، کہ ڈھاکہ تشریف لایئے میں اپنے طبیب حکیم حبیب الرحمن (خان بہادر) سے علاج کرادوں گا۔ خواجہ صاحب کچھ عرصے ڈھاکہ میں نواب صاحب کے مہمان رہے اور کچھ عرصے کلکتہ میں سر عبداللہ ہارون سہروردی اور ان کی بہن سہروردیہ بیگم کے۔ قیام ڈھاکہ و کلکتہ کا حال "نظام المشائخ" میں چھپا تھا۔ اُس کے دو جملے یہاں نقل کرنے کے قابل ہیں۔ ڈھاکہ کے حال میں لکھا تھا:۔

"نواب سلیم اللہ خاں کے دو بچے مجھے بہت ہونہار معلوم ہوئے ایک کا نام ناظم الدین ہے۔ دوسرے کا شہاب الدین"

کلکتہ کے حال میں لکھا تھا:۔

"سہروردیہ بیگم کے دو لڑکے علی گڑھ میں پڑھتے ہیں، آج کل کلکتہ آئے ہوئے تھے، میں نے اُنھیں غیر معمولی ذہین پایا۔ ایک کا نام حسین شہید ہے۔ دوسرے کا حسن شہید"

خواجہ ناظم الدین۔ خواجہ شہاب الدین اور مسٹر حسین شہید سہروردی کو تو ناظرین پہچان گئے ہوں گے۔ (۱) پاکستان کے گورنر جنرل۔ (۲) وزیر داخلہ اور (۳) وزیر اعظم ہیں۔ مسٹر حسن شہید سہروردی بھی پاکستان میں اعلیٰ مرتبہ پر فائض ہیں۔ وہ علمی آدمی ہیں۔

سفرِ ڈھاکہ و کلکتہ کے بعد حکیم محمود علی، مولوی مقبول احمد کی طرح رخصت ہو گئے

بھیّا احسان الحق

میرٹھ کے نوجوان رئیس بھیّا شیخ احسان الحق کبھی کبھی پھیرا کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی میں اور خواجہ صاحب میرٹھ جا کر اُن کے مہمان بنتے تھے۔ بھیّا احسان کے ماموں اور خسر خان بہادر بھیّا شیخ وحید الدین سی۔ آئی۔ ای۔ میرٹھ کے رئیس اعظم تھے۔ بھیّا احسان کے لئے لفظ "رئیس" میں نے یوں ہی استعمال نہیں کیا ہے، ان کی زندگی واقعی رئیسانہ تھی لیکن رئیسوں کے معائب سے پاک۔

بھیّا احسان کی والدہ نے بھائیوں (بھیّا وحید الدین اور بھیّا بشیر الدین) سے موروثی جائداد اور جاگیر کا حصہ نہیں لیا تھا۔ دونوں ماموں اُنھیں اپنی اولاد کی طرح رکھتے تھے۔ بھیّا احسان کے والد شیخ سبحان بخش بھی امیر آدمی تھے، وہ دلّی میں آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمیٹی کے ممبر تھے۔ مگر بھیّا احسان والدہ کے پاس میرٹھ میں رہتے تھے۔

میں اور خواجہ صاحب بھیّا کے ہاں جاتے، تو بھیّا ہماری رئیسانہ مدارات کرتے عمدہ عمدہ کھانے کھلاتے۔ اپنی گاڑی میں میرٹھ کی سیریں کراتے۔ ریلوے اسٹیشن پہنچاتے اور سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ خرید کر ہمیں دلّی روانہ کر دیتے۔

اسی جگہ جہاں ساری بھیّا فیملی رہتی تھی (اور رہتی ہے) بھیّا کا الگ دیوانخانہ تھا۔ صاف ستھرا آراستہ۔ آراستگی میں نایاب کتابوں کی الماریاں تھیں۔

بھیّا نے بی۔ اے تک انگریزی وغیرہ پڑھی ہے۔ اور فارسی، عربی دینیات کے پورے عالم ہیں؛ انگریزی کے لیے انھیں کالج جانا پڑا تھا۔ لیکن دینی اور مکتبی علوم اُنھوں نے جیّد علماء سے گھر پر حاصل کیے۔ ٹھوس قابلیت کے آدمی ہیں اور تمام

قابلیتوں کے باوجود منکسر مزاج۔ تواضع اور انکسار بھیا فنیلی کو گھٹی میں پلایا جاتا ہے۔ میں خواجہ صاحب کا مرید تھا۔ اور بھیا مولانا محمد عمر اخوندجی قادری دفراشخانہ، دلی، سے بیعت تھے۔ مگر بھیا نے خواجہ صاحب کا جیسا ادب ۱۹۰۸ سے ۱۹۵۴ء تک ملحوظ رکھا، میں اُس کا پاسنگ ادب نہ کر سکا۔

بھیا خواجہ صاحب سے میری طرح بے تکلف تھے۔ ۱۹۱۷/۱۹۱۸ میں جب بھیا کے والد کا انتقال ہوگیا اور اُدھر والدہ رحلت کر گئیں تو بھیا میرٹھ سے دلی آگئے تھے۔ اور ۱۹۱۷/۱۹۱۸ سے ۱۹۵۴ تک بھیا کا خواجہ صاحب سے ملنا جلنا میرے برابر رہا خواجہ صاحب باغ وبہار انسان تھے، اہلِ تکلف کے ساتھ بے تکلفی اور شگفتگی سے بات کرنے کے عادی۔ بھیا کے ساتھ بھلا منہ پھُلا کر اور منہ سُجھا کر کیسے بات کر سکتے تھے۔ اور بھیا شگفتگی کا جواب شگفتگی سے دیتے تھے۔ لیکن کیا مجال جو فرقِ مراتب کو فراموش کر جائیں اور ادب آداب میں فرق آجائے۔

ادب آداب میں فرق نہ آنے دینا بھیا فنیلی کی خصوصیت ہے۔ بھیا فنیلی کا ایک خاص لباس تھا۔ اور بھیا فنیلی کا ملنے جُلنے کا انداز بھی خاص تھا۔ وہ خوش نما لباس نوجوانوں سے رخصت ہو رہا ہے مگر وہ عاجزانہ و مودبانہ طرزِ ملاقات باقی ہے خُردی و بزرگی کا رکھ رکھاؤ ابھی تک بھیا فنیلی کا حصہ ہے۔ بھیا کراچی میں ہیں۔ میری قیام گاہ سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر۔ میں پندرھویں دن اُن سے ملنے جاتا ہوں۔

پریمی صاحب

چوتھے صاحب جنھیں خواجہ صاحب کی شروع شروع ملاقات میں دیکھا مسٹر نظام الدین قریشی پریمی تھے۔ پریمی کا لقب خواجہ صاحب نے دیا تھا۔

پریمی صاحب احمد آباد (گجرات) کے باشندے تھے۔ دوری کے سبب

میرے برابر یا بھیّا احسان کے برابر خواجہ صاحب کا اور اُن کا ساتھ نہیں رہا لیکن میں اُنھیں خواجہ صاحب کا اپنے جیسا اور بھیّا جیسا مخلص خیال کرتا ہوں۔ وہ اگر خواجہ صاحب کے ساتھ ہماری طرح رہتے تو بھیّا سے تو نہیں مجھ سے بڑھ جاتے۔ بھیّا کے اور بریلی صاحب کے اخلاص کا میں مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں بس اُس کا مخلص ہوں جو اخلاص میں پہل کرے۔ بھیّا اور بریلی صاحب اپنے اور پرائے سب کے مخلص تھے بھیّا بفضلہٖ زندہ ہیں اور آج بھی اپنے اور پرائے کے مخلص ہیں۔ کام آنے والے بریلی صاحب کا انتقال ہو چکا۔

پانچویں صاحب غلام نظام الدین خاکسار عالم تھے، جن کا تذکرہ آپ نے چند صفحے پہلے پڑھا ہے۔

اِن پانچ میں سے تین کے ساتھ اور میرے ساتھ خواجہ صاحب کے تعلقات مسلسل اور غیر معمولی رہے۔ مولوی مقبول احمد سیوہاروی اور حکیم محمود علی خاں ماہر اکبر آبادی کے تعلقات بھی ٹوٹے نہیں تھے۔ سیوہاروی صاحب کئی، کئی سال بعد آتے تھے، مگر آتے تھے اکبر آبادی صاحب نے دوبارہ دلّی میں مستقل قیام کر لیا تھا۔ وہ خواجہ صاحب کے ہاں کی ہر تقریب میں شریک ہوتے تھے۔ نتھی البتہ خواجہ صاحب کے ساتھ میں تھا اور بھیّا احسان تھے اور میری اور خواجہ صاحب کی تو تقدیریں وابستہ تھیں۔

میرے لئے خواجہ صاحب کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اہل دعیال کا سا جذبہ ڈال دیا تھا۔ خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ میں اُن کی مثل پھلوں پھولوں اور کامیاب ہوں۔ ہم دونوں گاڑی کے دو گھوڑے بن جائیں۔

ایک لطیفہ

حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی نے مُرید کرنے کے کچھ دن بعد خواجہ صاحب کو

لوگوں سے بیعت لینے کی اجازت دیدی تھی ۔ خواجہ صاحب کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کرنے والے پہلے شخص ریاست ریواں کے مولوی عمر دراز نظامی تھے، پھر ریواں میں اور بہت سے لوگ مرید ہوئے تو مولوی عمر دراز نظامی اُن کے سربراہ قرار پائے۔ مولوی صاحب خواجہ صاحب سے تیس، پینتیس برس بڑے ہوں گے، لیکن وہ خواجہ صاحب کی جانشینی کے امیدوار تھے ۔ خواجہ صاحب نے مجھے کارکن حلقہ نظام المشائخ اور نائب خواجہ حسن نظامی اور نہ جانے کیا کیا مشہور کر دیا ۔ رسالہ نظام المشائخ نکلا تو اُس پر میرا نام بطور نایب ایڈیٹر چھپا ۔ خواجہ صاحب ایڈیٹر اور میں نایب ایڈیٹر مولوی صاحب کا پیمانۂ صبر چھلک گیا ۔ اُنھوں نے خواجہ صاحب کو شکایت لکھی کہ حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں، میرا حق دوسرے کے حوالے کئے دیتے ہیں ۔

المختصر خواجہ صاحب مجھ پر بے انتہا مہربان تھے اور چاہتے تھے کہ میں دوسرا حسن نظامی بن جاؤں ۔ مگر میں گھوڑا نہیں بن سکا ۔ بجلی کے دو تاروں میں کا ایک تار بن گیا ۔ میں خواجہ صاحب کے کاموں میں اس طرح شامل رہا جس طرح مثبت و منفی تار رہتے ہیں ۔ گھوڑے کی حیثیت سے میں خواجہ صاحب کی رفتار میں حایل ہوتا تھا ۔ خواجہ صاحب کو دوڑنے نہیں دیتا تھا، لیکن تار کی حیثیت سے میں انکے کاموں کی بقا میں مددگار تھا ۔ میں نے خواجہ صاحب کے اخلاص کی خاص قدر کی

اللہ اللہ ۱۹۰۸ ۔ ۱۹۰۹ کا زمانہ، خواجہ صاحب سلطان جی سے دلّی تشریف لاتے تھے تو میرے ہاں ہوتے ہوئے نواب مُدّھن کے گھر جاتے تھے[۱] ۔ میں بھی

---

[۱] یہ وضع خواجہ صاحب کی مدت العمر رہی ۔ دلّی وہ روز آتے تھے ۔ میرا مکان چہ چیلاں میں، دلّی دروازہ کے پاس تھا ۔ یعنی دلّی میں گھُستے ہی ۔ مجھ سے ملے بغیر آگے نہیں بڑھتے تھے ۔ انقلاب ۱۹۴۷ کے بعد بھی کم از کم عید، بقرعید کا آنا اُنھوں ترک نہیں کیا ۔ میری چھوٹے ہوئے مکان کو گلے لگا جاتے تھے ۔

بلاناغہ عصر، مغرب کے درمیان حاضرِ خدمت ہوتا اور اُنھیں لے کر جامع مسجد کے نیچے، سموسے پر شربت والے کی دُکان تھی، وہاں جا بیٹھتا۔ دکاندار کا نام بھول گیا۔ خلیفہ عُرف تھا۔

شام کے وقت جامع مسجد کے جنوبی اور مشرقی جانب اب بھی میلہ لگا رہتا ہے جب بھی میلہ لگا رہتا تھا۔ بلکہ موجودہ میلہ گزشتہ میلوں کی نقل ہے۔ ۱۹۰۸ - ۱۹۰۹ میں خلیفہ شربت والے کی دکان کے آگے سے، اُس تہذیب و تمدن کے مجسمے گزرتے تھے جس کی بنیاد جلال الدین اکبر نے ڈالی تھی اور جو دَورِ بہادر شاہ ظفر میں نقطۂ کمال کو پہنچ گئی تھی اور ۱۹۰۸ - ۱۹۰۹، بلکہ ۱۹۱۱ تک مکمل موجود تھی۔

۱۹۰۸ - ۱۹۰۹ کی دلّی مولوی الطاف حسین حالی۔ منشی وحید الدین بیخود نواب سراج الدین احمد خاں سائل۔ نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں۔ آغا شاعر مولانا عبد الرحمن راسخ۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ پنڈت امرناتھ ساحر پنڈت ترلوکی ناتھ زتشی زار۔ بابو مہاراج بہادر برق۔ لالہ سری رام صاحب (صاحب خمخانہ جاوید) منشی ذکاء اللہ۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ ڈپٹی ضیاء الدین۔ ڈپٹی ہادی حسین خاں موی محمد حسین آزاد۔ نواب سلطان مرزا۔ نواب فیض احمد خاں۔ حکیم اجمل خاں حکیم غلام رضا خاں۔ حکیم احمد سعید خاں۔ نواب احمد سعید خاں، نواب سر امیر الدین احمد خاں (والی لوہارو)، لالہ سری کرشن داس گڑوالے۔ لالہ رام کشن داس چُھنّامل والے۔ لالہ ٹھاکر داس دلی پرنٹنگ ورکس والے۔ حاجی عبد الغفار حاجی علیجان والے۔ میر ناصر علی (ایڈیٹر رسالہ صلائے عام) میر ناصر نذیر فراق۔ مفتی کفایت اللہ شاہ ابو الخیر۔ میاں امیر حسین۔ میاں عبد الصمد۔ مولانا محمد عمر اخوندجی قاری سرفراز حسین۔ امراؤ مرزا حیرت۔ نواب غلام محمد حسن خاں۔ مولوی بشیر الدین۔ مولانا اسد الخیری منصف نثار احمد۔ خواجہ محمود حسین۔ مشتاق احمد زاہدی۔ مرزا محمد سعید۔ حکیم محمد احمد خاں

لالہ سلطان سنگھ۔ لالہ مدن موہن۔ سر شری رام۔ خواجہ فضل احمد خاں شیدا اور خواجہ حسن نظامی کی دلّی تھی۔ حکیم رضی الدین۔ حکیم شجاع الدین اور حکیم سراج الدین کی دلّی مولوی سیّد احمد (صاحب فرہنگ آصفیہ) اور مولوی سیّد احمد امام جامع مسجد کی دلّی

اہلیہ اوّل کا انتقال

نظام المشائخ کا دفتر ابھی نواب بُدھن کے کمرے پر تھا کہ خواجہ صاحب کی اہلیہ اوّل، حبیب بانو کا انتقال ہو گیا اور حور بانو سے چھوٹے دو لڑکے تھے، وہ بھی داغِ جُدائی دے گئے۔

اِن مصائب سے سابقہ پڑا ہے تو علاّمہ شبلی نعمانی خواجہ صاحب کے مہمان تھے۔ اُن کے قیام کے دوران میں بیماریاں آئیں اور موتیں ہوئیں۔ وہ مہینہ، ڈیڑھ مہینہ رہے تھے۔ خواجہ صاحب نے جیسے صبر و ضبط سے یہ حادثے برداشت کئے علاّمہ شبلی کو اُس پر حیرت تھی۔ اُنھوں نے فرمایا۔ میں تو بیوی کے مرنے سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ اور اس کا علاّمہ شبلی کیا، مجھے علم نہیں تھا کہ حادثے ایسی حالت میں پیش آئے ہیں کہ خواجہ صاحب کی جیب خالی ہے۔ بیوی بچے مر رہے تھے اور اُن کا ٹھیک طرح علاج نہ کرایا جا سکے۔ اِسے استقلال کے ساتھ برداشت کرنا خواجہ صاحب ہی کا حق تھا۔

حلقہ نظام المشائخ کا دفتر بستی حضرت نظام الدین سے کمرہ نواب بُدھن پر منتقل کر لینے اور دن بھر درگاہ سے دور رہنے کے باوجود اہلِ درگاہ کی یورشیں جاری تھیں۔ مصائب نے اقربا کا دل نرم نہیں کیا تھا آخر طے پایا کہ خواجہ صاحب بستی حضرت نظام الدین کو خیرباد کہیں اور مع حور بانو میرے ہاں آ جائیں۔ حور بانو کی عمر قریباً پانچ سال تھی۔

میرے ہاں چلے آنے کا اچھا اثر ہوا، مخالفت کی آگ قدرے دبی۔ اہلِ درگاہ کو وہم تھا کہ اصلاح، اصلاح تو محض بہانہ ہے، اصل منشا درگاہ پر قبضہ جمانا ہے۔ چنانچہ حکیم اجمل خاں سے اُنھوں نے کہا کہ ڈھاکہ اور کلکتہ کے سفر اور وائسرائے کی ملاقات کا مقصد یہی تھا کہ "ہم سب کو نکال دے اور خود درگاہ کا مالک بن جائے حسن نظامی کا زور بڑھتا جاتا ہے۔" (کلکتہ میں خواجہ صاحب لارڈ منٹو وائسرائے ہند سے بھی ملے تھے۔) مگر درگاہ اور درگاہ کی بستی کا قیام ترک کر دینے سے اس وہم میں کمی پڑ گئی۔

امام صاحب مسجد درگاہ کا خواب

اُدھر حافظ سید علیم الدین، امام مسجد درگاہ نے خواب دیکھا کہ حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں۔ حسن نظامی میرا ہے، اُس کی مخالفت نہ کرو۔ وہ خواجہ صاحب کے پاس تشریف لائے اور رو رو کر خواب بیان کرتے رہے اور خواب لکھ کر دے گئے

صاحبزادگانِ درگاہ میں امام صاحب معمر ترین شخص تھے صرف سید شرف الدین سے چھوٹے۔ خواجہ صاحب کی مخالفت کے دو عظیم لیڈروں میں سے ایک۔

ایک اور ننھی سی مخالفت

لیکن تھوڑی سی مخالفت خواجہ صاحب کی میرے ہاں بھی تھی۔ خواجہ صاحب کے خاندان ہی کے ذریعہ میرے خاندان میں پہنچی تھی۔ درگاہ شریف کے ایک صاحبزادہ میری پھوپی سے ملنے آیا کرتے تھے۔ نام مجھے یاد نہیں۔ غالباً خواجہ صاحب کے حقیقی چچا کے بیٹے تھے۔ مضبوط ہاڑ تھا اور تشکادیوں کا سا لباس پہنتے تھے۔

پھوپی صاحبہ میر مشتاق علی وکیل[1] کی بہو تھیں میر مشتاق علی صاحبزادگانِ درگاہ میں سے تھے اور خواجہ صاحب کے اتنے قریبی رشتہ دار کہ پھوپی صاحبہ خواجہ صاحب کے چچازاد بھائی سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔

وہ صاحب آ آکر کہتے تھے کہ بھتیجے کو روکئے۔ کہاں حسن نظامی کے پھندے میں جا پھنسا ہے۔ حسن نظامی اُسے لوٹ کھائے گا۔ پھوپی صاحبہ اُن صاحب کا یقین کرتی تھیں اور میرے بعض کنبے والے بھی اُن صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔

چھ مہینے میرے ایک بزرگ نے اُس مکان کو خالی نہیں ہونے دیا جس میں نظام المشائخ کا دفتر منتقل کرنا تھا، خواجہ صاحب پھوپی صاحبہ کے بالکل ویسے عزیز تھے جیسے اُن کے چچازاد بھائی تھے، لیکن خواجہ صاحب پھوپی صاحبہ کے پاس نہیں آتے تھے، خدا جانے کیوں۔ میں نے خواجہ صاحب سے اس کا سبب نہیں پوچھا۔

بہرحال پھوپی صاحبہ خواجہ صاحب کے سخت خلاف تھیں۔ یہاں تک کہ نظام المشائخ کے اجراء کے وقت میں نے پھوپی صاحبہ سے پہلے پرچے کے آدھے خرچ، بچھتر روپے کا مطالبہ کیا تو اُنھوں نے کہا کہ جائداد کے علاوہ سب چیزوں زیور کپڑے۔ چوکی۔ تخت سے فارغ خطی تحریر کردو اور بچھتر روپے لے لو۔

پھوپی صاحبہ میری اور میرے چھوٹے بھائی بہن کی قانونی ولی تھیں، اُنھیں ہمارے آمد و خرچ کا ڈسٹرکٹ جج کے ہاں سال کے سال حساب بھیجنا پڑتا تھا۔

نظام المشائخ کے پہلے پرچے پر ڈیڑھ سو روپے لاگت آئی تھی بچھتر روپے

---

[1] میر مشتاق علی اور عزیز الدین (جن کے نام پر کوچہ پنڈت میں گلی عزیز الدین ہے) ۱۸۵۷ء سے پہلے کے دو مشہور وکیل تھے۔

خواجہ صاحب نے لگائے تھے۔ پچھتر میں نے۔

پرچے کا نمونہ خواجہ صاحب کے معتقدوں اور شناساؤں کو روانہ کیا گیا اتنے خریدار ہو گئے کہ دوسرے پرچے کی تیاری کے لائق روپیہ آگیا اور پھر دوسرا پرچہ تیسرے پرچے کے لئے اور تیسرا پرچہ چوتھے کے لئے روپیہ لاتا رہا۔

یوں کہنا چاہیئے کہ پچھتر روپے کے سرمایہ سے میں نے کاروبار چلایا تھا۔

اپنا کاروبار اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ خواجہ صاحب نے ۱۹۱۲/۱۹۱۳ میں بستی حضرت نظام الدین کی دوبارہ رہائش اختیار کی تو خواجہ صاحب نظام المشائخ کی ملکیت سے دست بردار ہو گئے تھے۔ میں نے نظام المشائخ کے بل پر کتابوں کی اشاعت (Publishing) کا کام شروع کیا۔ چھاپہ خانہ کھولا۔ مولانا راشد الخیری اور دوسرے مصنفوں سے کتابیں تصنیف کراتا تھا اور گھر کے چھاپہ خانے میں چھپواتا تھا، کئی اخبار اور رسالے جاری کر دیئے۔ خاصے کروڑ فر کا کاروبار ہو گیا۔

پھوپی صاحبہ نظام المشائخ کے نکلتے ہی بگڑ کر مدینہ منورہ ہجرت کر گئی تھیں اور وہاں اُنکا انتقال ہو گیا تھا۔ پھوپی صاحبہ دلی میں ہتیں اور زندہ ہتیں تو اب خفگی کی بجائے یقیناً اظہارِ مسرت کرتیں۔ لیکن کنبے میں بعض اقارب کالعقارب تھے، اُنھوں نے کہا کہ چار دن کی چاندنی ہے۔

خواجہ صاحب کے قیام سے میرا مکان مرجع خلائق بن گیا تھا اور خواجہ صاحب کے طفیل اُن کے سلطانجی چلے جانے کے بعد بھی جامع مسجد کے علاقے میں تیسرے نمبر کا پُر رونق مکان تھا۔ نمبر ۱ مکان مولانا محمد علی کا تھا اور نمبر ۲ مولانا شوکت علی کا۔ نواب مصلح الدین رسول شاہی (مرزا مسعود کے ماموں) اکثر تشریف لاتے تھے۔ اور مکان کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے، بھائی ہم رسول شاہیوں کا عمل تو اس پر ہے، ہر خانہ راکہ روشن بینی شاد شو۔

ہاں! یہ بات یہاں صاف کر دوں کہ خواجہ صاحب کے متعلق اُن کے چچازاد بھائی، بھوپی صاحبہ سے جو کہا کرتے تھے۔ اُس کی مطلق اصلیت نہیں تھی۔ خواجہ صاحب نے کبھی، از ابتدا تا انتہا مجھ پر ایک پیسے کا بار نہیں ڈالا۔

ایسا تو ہوا ہے کہ میں نے اُن سے روپیہ لیا قرض نہیں، اپنا سمجھ کر مجھے خواجہ صاحب کا احسان اُٹھانے میں مزا آتا تھا۔ لیکن خواجہ صاحب نے نظام المشائخ جاری کیا تو اپنے حصے کے پچھتر روپے پہلے رکھ دیے اور میرے ہاں رہنے اور کھانے پینے لگے تو اپنا اور حور بانو کا اور ایک لڑکا تھا، وحید الرحمٰن عرفانی سب کا بھر مٹھی رقم دیتے تھے۔

وحید الرحمٰن عرفانی یتیم لڑکا تھا، سینٹ اسٹیفنز مشن کالج میں پڑھتا تھا۔ خواجہ صاحب اُس کی فیس بھی ادا کرتے تھے، وہ لڑکا آج بوڑھا ہے۔ میرٹھ کالج کی پروفیسری سے ریٹائر ہوا ہے۔ ڈاکٹر وحید الرحمٰن عرفانی، پی۔ ایچ۔ ڈی۔

خواجہ صاحب عجیب حوصلے کے انسان تھے، اُن کا حوصلہ، اُن کے تمام وصفوں پر غالب تھا۔

ایک واقعہ ایسا نہیں ہے کہ میں اور خواجہ صاحب بازار گئے ہوں اور ہم نے چائے پی ہو، چائے نہیں[۱]، شربت اور فالودہ، یا سوڈا لیمن پیا ہو، اور خواجہ صاحب نے پیسے مجھے دینے دیئے ہوں۔ جیب سے بٹوہ نکالتے اور فرماتے، اسے خالی نہ کروں گا تو یہ بھرے گا کیسے؟ اس زمانہ کی بات کہہ رہا ہوں، جب یہ بٹوہ ہی خواجہ صاحب کی کُل کائنات تھا۔

خواجہ صاحب کے ہاتھ کی موٹی سی بید جس پر چاندی کی موٹھ تھی، اور

---

[۱] چائے کا اُس زمانے میں رواج کم تھا۔

حسن نظامی گندہ تھا۔ اور یہ بوڑھ محفوظ کر لینے کی چیزیں تھیں۔

غرض کہ خواجہ صاحب نے مجھ پر کبھی ادنیٰ سے ادنیٰ بار نہیں ڈالا، اور حوصلے کا یہ عالم تھا کہ مجھ سے کبھی شکایت نہیں کی کہ تمھارے کنبے والے کیا کہتے پھرتے ہیں۔ اپنی آپ بیتی میں، خواجہ صاحب نے اپنے کنبے کا دُکھڑا تو بیان کیا ہے، میرے کنبے کی کہانی، نظر انداز کر دی۔ خواجہ صاحب بہت اونچے انسان تھے۔ اُنھیں بہت اونچا جانا تھا۔ انھوں نے اپنے کنبے کا دُکھڑا بھی ۱۹۱۹ میں بیان کیا ہے اور محض حکایتاً سبق آموزی کی نیت سے بیان کیا ہے۔ کنبہ جب کانٹے بچھا رہا تھا، اُس وقت وہ راستہ کاٹ کر کانٹوں سے بچ جاتے تھے۔ کانٹے ہٹاتے یا کانٹوں میں اُلجھتے نہیں تھے۔ کانٹے ہٹانے اور کانٹوں میں اُلجھنے کی فرصت کہاں تھی، کوئی اور بھی مخاطب ہو کو جواب دینا چاہتا تو اُسے منع فرما دیتے تھے۔ اور حضرت سلطان المشائخ کا یہ قول دُہرا دیتے تھے "کشندہ کشندہ بود" جو برداشت کرلیتا ہے وہ مار ڈالتا ہے۔ جب زیادہ گھبراتے تھے تو گھر سے دور چلے جاتے تھے۔

سفر کرنے اور اخبار نکالنے کا شوق

سفر کرنے اور اخبار نکالنے کا شوق لڑکپن سے تھا۔ نوجوانی میں ہندوستان کے دور دراز مقامات جا جا کر دیکھ لئے تھے۔ سفرنامہ ہندوستان کا نام، ایک نٹ نوٹ میں لکھ چکا ہوں، اور ہندو تیرتھوں کی سیاحت تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مخالفت کی عمارت اِسی بنیاد پر کھڑی کی گئی تھی۔

سفر پیرزادے کی حیثیت سے کئے ہیں۔ لیکن بس باپ اور بھائی کے ساتھ۔ سفر اخبار نویس کی حیثیت سے کئے ہیں، مگر اخبار نکالنے سے پہلے۔ زیادہ تر سفر یا بحیثیت پیر اور لیڈر ہوتے تھے، یا سفر برائے سفر۔

اخبار نویس کی حیثیت کا ایک سفر مجھے معلوم ہے۔ بڑا تکلیف دہ تھا، اس نے اخبار نویسی کے سفر سے توبہ کرادی۔

اُردو اخبار نویسی دورِ طفلی ختم کر رہی تھی، اکمل الاخبار۔ افضل الاخبار اور اشرف الاخبار قسم کے اخبار دلّی سے نکلتے تھے۔ اکمل الاخبار تو خیر شریف خانیوں کا اخبار تھا۔ حکیم اجمل خاں جیسے شخص چند دن اُس کے اڈیٹر رہے۔ اکمل الاخبار بے وقار نہیں تھا۔ لیکن اور اخبار نام کے اخبار تھے۔ کسی راجہ نواب کے ہاں کوئی تقریب ہوئی اور اخبار نویس صاحب نے تقریب کا اعلان اور قصیدہ وغیرہ لکھا اور دس بیس خبریں اِدھر اُدھر کی ملائیں اور اخبار کی دس بیس کاپیاں چھپوائیں اور لے کر راجہ، نواب کے پاس پہنچ گئے اور انعام اکرام لے آئے۔ اس کے بعد اخبار مہینوں غائب۔

اشرف الاخبار کا دفتر میرے کوچہ چیلان والے مکان کی برابر تھا۔ اخبار کے لفظ سے مجھے اشرف الاخبار نے آشنا کیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر محمد مرزا خاں نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا آخری زمانہ دیکھا تھا۔ اس قدر بوڑھے تھے کہ لوگ اُنھیں نوح کہا کرتے تھے، مگر بڑھاپے میں میدہ شہاب رنگ، سفید بگلہ ڈاڑھی۔ شریف اور بزرگ صورت۔ شریفانہ اور بزرگانہ وضع طرح۔ غرض بڑے وجیہہ اور شاندار تھے، وہ ہر سال مسقط جاتے تھے اور مسقط سے اتنے پیسے لاتے تھے کہ مسقطی پیسہ دلّی میں چلنے لگا تھا مسقطی پیسہ کا وزن انگریزی پیسے سے دُگنا تھا۔ پھر کیوں نہ چلتا۔

ہاں تو ایک سفر ایسا خواجہ صاحب نے بھی کیا، اس سفر کا حال خواجہ صاحب کی زبانی سُنیے:۔

"رزق کی تنگی کے اسی عہد میں ایک دفعہ بھاول پور جانا ہوا۔ نواب صاحب بھاول پور کی سالگرہ تھی۔ دلّی کے اخبار والوں نے کہا تم بھی چلو، انعام ملے گا۔ چنانچہ میں انعام یا خیرات کی خاطر سفر کے لئے تیار ہوگیا۔ مگر میرا اخبار کونسا تھا جس کی بنا

پر مجھے انعام ملتا۔ شہزادہ مرزا محمد اشرف صاحب بی۔ اے دہلوی، وہاں افسر تھے
اُن کے نام شہزادہ مرزا امیر الملک (عرف مرزا بلاقی) نے خط لکھ کر عنایت فرمایا تھا
اُس کی بدولت مرزا محمد اشرف صاحب نے ایک وقت مہمان بنایا۔ اور دوسرے
وقت کہا کہ سرائے جائیے۔ میں نہایت ذلت سے ریاست کی سرائے میں آن پڑا جہاں
اور اخبار والے اور شاعر مقیم تھے۔ چند دن وہاں گزارے اور بالآخر سخت تکلیف
اور رُسوائی اُٹھا کر گھر واپس آ گیا۔

ہمراہیوں نے کہا بھی کہ ہم قصیدہ لکھ دیتے ہیں، وہ پیش کر دو، یا فرضی اخبار
کے ایڈیٹر بن جاؤ۔ مگر لیکن میں نے اِسے قبول نہ کیا۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ میرے ضمیر پر
اس سفر نے کیسی کیسی قیامتیں ڈھائیں۔ یہ سفر انتہائی بے غیرتی کا تھا۔

آج اللہ کے فضل سے مولانا رحیم بخش صاحب مدار المہام بہاولپور، اور
دوسرے اراکینِ ریاست بہاولپور آنے کی دعوتیں دیتے ہیں۔ اور مجھے جانے کی
فرصت نہیں ہے، یا وہ وقت تھا کہ بھکاری کی حیثیت سے گیا تھا۔ اور سرائے میں
میں پڑا رہا تھا اور اخبار والوں اور شاعروں کے ساتھ چند روپے حاصل کرنے کی
غرض سے دَربدر کے دھکے کھاتا پھرا تھا۔ آج وہی شہزادہ مرزا محمد اشرف میرے
دوست ہیں اور مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جنھوں نے ایک وقت سے زیادہ
اپنے گھر میں رہنے نہ دیا تھا۔

اِس واقعہ میں نصیحت ہے، نااہل سائلوں کے واسطے۔ محنت کر کے معاش
کمانا، ہزار عزتوں کی ایک عزت ہے، اور دوسرے کا محتاج بننا اور دوسرے کے
آگے ہاتھ پھیلانا، لاکھ ذلتوں کی ایک ذلت ہے، کیسی ہی مفلسی اور تنگ دستی ہو
دوسرے کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔ اور محنت مزدوری کر کے مفلسی سے لڑو کسی پیشے
اور محنت سے مت شرماؤ کہ اپنا ذاتی کام کرنا بے غیرتی نہیں ہے۔

بزرگوں نے کہا تھا کہ طمع کے تین حرف ہیں اور تینوں خالی ہیں۔ میں نے اس سفر میں بزرگوں کا یہ قول آزمایا اور طولانی سفر سے خالی ہاتھ واپس آیا۔ جو قرض لے کر گیا تھا۔ اُس کی ادائیگی مشکل ہو گئی۔

اگرچہ طمع کے سبب میں بہاول پور نہیں گیا تھا، کیونکہ طمع اِسے کہتے ہیں کہ پاس روپیہ موجود ہو اور پھر اور روپے کی خواہش کی جائے۔ میرے پاس اُس زمانے میں کچھ نہیں تھا، میں طمع سے نہیں بلکہ ضرورت سے مجبور ہو کر بہاولپور گیا تھا مگر قدرت نے کہا کہ مفت کا خیال ہی کیوں آیا محنت کیوں نہ کی تو یہ اس کی سزا ہے۔"

کچھ عرصے بعد خواجہ صاحب نے بہاول پور کا سفر پھر کیا اور نواب بہاولپور کی مسند نشینی کے جشن پر گیا۔ لیکن یہ سفر بے عزتی کا نہ تھا، عزت کا تھا۔ حضرت شاہ سلیمان پھلواروی شریک سفر تھے۔ شیخ عبدالقادر ہونے والے جسٹس سر عبدالقادر سے اسی جشن میں تعارف ہوا۔ شیخ صاحب نے خواجہ صاحب کو دیکھ کر فرمایا:۔ شیخ محمد اقبال (ہونے والے ڈاکٹر سر محمد اقبال —— علامہ اقبال) کا خیال تھا کہ آپ بہت بڈھے ہیں، لیکن میں کہتا تھا کہ نہیں نوعمر ہیں۔ میرا اندازہ صحیح رہا۔

اخبار وکیل امرت سر کے مالک شیخ غلام محمد نے امرت سر آنے کی دعوت دی۔ شیخ غلام محمد کے ہاں خواجہ صاحب کافی دن ٹھہرے۔ دفتر وکیل میں حافظ عبدالرحمٰن امرت سری سیاح ممالک اسلامیہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا کے بڑے بھائی مولانا ابوالنصر آہ سے ملاقات ہوئی۔ مولانا ابوالکلام وکیل کے ایڈیٹر تھے[۱]

۱؎ ۶-۱۹۰۵ء کی بات ہے۔ مسٹر آصف علی اور مولانا ابوالکلام (باقی حاشیہ صفحہ ۹۶ پر)

شیخ غلام محمد کی بابت خواجہ صاحب "آپ بیتی" میں رقمطراز ہیں :۔

"شیخ غلام محمد مرحوم کی چند روزہ صحبت نے اخلاق و عادات اور ضروریاتِ قوم سے آگاہ کیا۔ خصوصاً شیخ غلام محمد مرحوم کے اخلاص و صداقت نے جو سارے پنجاب کے اخبار نویسوں میں ممتاز شان رکھتی تھی۔ دنیا میں تحریری خدمتِ قوم کا ایک راستہ بتایا۔"

پنجاب سے دلّی کی نسبت وزنی اخبار نکلنے لگے تھے۔ وکیل امرت سر۔ وطن لاہور۔ پیسہ اخبار لاہور۔ اُس دور کے معیاری مسلم اخبار تھے۔ بلکہ وکیل تو آج کل کے معیار پر پورا اُتر سکتا تھا۔ وکیل میں مولانا ابوالکلام ـــــ اور مولانا عبداللہ عمادی جیسے متعدد ذی علم لوگوں نے کام کیا اور اُس وقت کے اخلاص سے آج کل کے خود غرض اور طوطا چشم دور کا مقابلہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔

امرت سر سے خواجہ صاحب لاہور پہونچے اور علاّمہ اقبال سے ملے۔ انجمن حمایت اسلام کا اجلاس دیکھا۔ امرت سر سے قادیان بھی گئے اور مرزا غلام احمد اور حکیم نورالدین سے ملاقات کی اور قادیانیت کے خلاف پہلا مضمون وکیل میں چھپوایا۔

یہ سفر تقریباً ترا سے قبل کے ہیں۔ ان ہی تھوں کے سفر کے وقت مولانا ابوالکلام الندوہ کے ایڈیٹر ہو کر لکھنؤ آ گئے تھے اور خواجہ صاحب لکھنؤ میں مولانا کے ساتھ

بقیہ حاشیہ صہ ۶۵ دونوں بیٹھے تھے۔ میں بھی پہنچ گیا۔ مجھے آصف صاحب کی اور آصف صاحب کو میری عمر کا علم تھا۔ وہ ۱۰ ؍ مئی ۱۸۸۸ء کی پیدائش میں ۱۷ ؍ مئی ۱۸۸۸ء کی باتوں باتوں میں مولانا نے بھی اپنا سنہ پیدائش ۱۸۸۸ بتایا اور مہینہ مئی کے بعد کا غالباً ستمبر یا اکتوبر۔ خواجہ صاحب مجھ سے آٹھ نو برس برس بڑے تھے۔ مولانا سے بھی آٹھ، نو برس بڑے ہوئے۔ اب حساب لگائیے مولانا وکیل امرتسر کے ایڈیٹر کس عمر میں تھے اور فارغ التحصیل کس عمر میں ہو چکے ہوں گے۔

رہے تھے۔ علامہ شبلی سے خواجہ صاحب کی اُسی وقت کی ملاقات تھی۔

سفر کا خواجہ صاحب کو شوق نہیں تھا، ہوکا تھا۔ اُن کی زندگی کا آدھے سے زیادہ حصہ سفر میں کٹا۔ سفر اُنھیں راس آگیا تھا اور اُن کے حق میں وسیلۂ ظفر تھا۔ وہ سیر تماشے کے لئے بھی سفر کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ سیر تماشہ پروگرام سے خارج ہوگیا تھا۔ اور وہ تو سیر تماشے سے بھی کام لے لیتے تھے۔

اسکول کے کورس میں Eyes and no eyes آنکھوں والے، اور بے آنکھوں کے طلبا کا قصہ پڑھا ہوگا۔ خواجہ صاحب آنکھوں والے تھے۔ مشاہدہ (observation) کی طاقت اُن میں غیر معمولی تھی۔ میں اور وہ بازار کی سیر کو جاتے۔ وہ بازار سے لوٹ کر بازار کی کسی چیز اور کسی بات پر مضمون لکھ دیتے تھے اور میں سوچتا رہ جاتا تھا کہ یہ چیز دیکھی تو میں نے بھی تھی اور یہ بات ہوئی تو میرے سامنے تھی۔ یہی حال تماشے کا تھا۔ میں اور وہ تھیٹر یا سینما جاتے وہ وہاں سے غور و فکر کی کیفیت لاتے۔ میں جیسا جاتا، ویسا آجاتا۔

میرے ہاں کے مستقل قیام پنج سالہ میں بھی سفر کا سلسلہ جاری تھا۔ مجھ "ازجا نمی جنبد" طبیعت کے آدمی کو اُنھوں نے کئی بار گھسیٹا۔ ایک دفعہ ہم دونوں امرتسر گئے۔ وہاں حضرت پیر جماعت علی شاہ موجود تھے۔ خواجہ صاحب کی راہ و رسم تھی۔ میں اوّل مرتبہ زیارت سے شرفیاب ہوا۔ پیر صاحب نے حال میں رحلت فرمائی ہے۔ اُس وقت ساٹھ کے لگ بھگ عمر تھی۔ نماز عصر کے بعد پیر صاحب ہمیں امرت سر کی نہر دکھانے لے گئے اور خوب خربوزے کھلائے اور ایک ایک تسبیح تحفۃً دی۔ پیر صاحب عصر اور مغرب کے درمیان بولتے نہیں تھے۔

ایک دفعہ میر غلام بھیک نیرنگ نے انبالہ بُلایا۔ مسلم ہائی اسکول کا افتتاح تھا۔ میر صاحب مقدمات کی پیروی کرنے پندرھویں، بیسویں دلی آیا کرتے تھے

اور میرے مہمان ہوتے تھے۔ مجھے بھی انبالہ جانا پڑا۔ وہاں میں پہلی مرتبہ علامہ اقبال سے ملا۔

علامہ اقبال نے خواجہ صاحب سے فرمایا۔ پٹیالہ سے آرہا ہوں۔ ذوالفقار علی نے کہا ہے، خواجہ صاحب کو لے کر آنا۔ چھوڑنا مت۔ اب آپ دلی نہیں جاسکتے پٹیالہ چلنا ہوگا۔ خواجہ صاحب نے عذر کیا کہ واحدی صاحب اپنے چھوٹے بھائی بہن کے ولی ہیں۔

انھیں ڈسٹرکٹ جج کے ہاں حساب پیش کرنا ہے۔ تاریخ سر پر ہے۔ علامہ اقبال نے ڈسٹرکٹ جج دلی کو تار دے دیا کہ تاریخ بدل دیجیے۔

نواب سر ذوالفقار علی خاں ریاست پٹیالہ کے وزیر اعظم تھے اور یو۔پی کے راجہ نوشاد علی خاں کی طرح نہایت ذی علم اور علم دوست سردار جوگندر سنگھ نئے نئے وزیر بنے تھے اور نواب صاحب ہی کی کوٹھی میں تھے۔ جوگندر سنگھ کے علم و فضل کا سکھوں میں جواب نہیں تھا۔ مرنے سے پہلے گورنمنٹ انگریزی نے دربار کو سر سے الگ کرکے انھیں سر جوگندر سنگھ کیا اور وائسرائے کی اکزکٹو کونسل کی ممبری دی۔ تین بڑی اہم شخصیتیں۔ چوتھے خواجہ صاحب۔ پانچواں میں۔ آٹھ دن مسلسل ہم پانچوں دن رات یکجا رہے۔

علامہ اقبال بے تکلف انسان تھے۔ آٹھ دن میں مجھ سے ایسے گھل مل گئے گویا برسوں کی ملاقات ہے اور خواجہ صاحب سے تو برسوں کی ملاقات تھی ہی۔ انگلستان جانے سے بہت قبل کی ــــ ۱۹۰۵ء میں بیرسٹری پڑھنے گئے ہیں تو خواجہ صاحب کے ہاں ہوتے ہوئے اور درگاہ سلطان المشائخ کے سامنے

---

۵۱ پھوپی کے انتقال کے بعد میں ولی مقرر ہو گیا تھا۔

کھڑے ہو کر یہ کہتے ہوئے گئے تھے ؎

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
بلایا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

ایک دفعہ میں خواجہ صاحب کے ساتھ لکھنؤ گیا لکھنؤ میں خواجہ صاحب نے نواب نور الحسن خاں اور نواب علی حسن خاں فرزندان نواب صدیق حسن خاں سے ملوایا۔

لکھنؤ سے واپس آ رہے تھے۔ کانپور میں گاڑی بدلنے اُترے۔ مولانا ابوالکلام بھی ہمارے ہم سفر تھے لیکن نمودار کانپور کے ریلوے اسٹیشن پر ہوئے۔ کشیدہ قامت چھریرا بدن۔ گورا رنگ۔ تر و تازہ چہرہ۔ اعلیٰ لباس۔ انھوں نے خواجہ صاحب سے کہا۔ یہاں کہاں پڑے رہیے گا۔ گاڑی کا انتظار ہلکان کر دے گا۔ دلی کی گاڑی رات کے دس بجے جائے گی اور ابھی دن کے دس بجے ہیں چلئے حافظ حلیم کی کوٹھی چلئے۔ شام کو ہم پہنچا دیں گے۔ میری اور مولانا ابوالکلام کی یہ پہلی ملاقات تھی۔

میں تین معمولی سفروں میں اتنے آدمیوں سے روشناس ہو گیا اور بڑے بڑے آدمیوں سے روشناس ہو گیا تو خواجہ صاحب کو تو اللہ تعالیٰ نے روشناسی کے واسطے پیدا کیا تھا۔ اُنھیں سفر کے ذریعہ کروڑوں آدمیوں سے روشناسی حاصل ہوئی اور بڑے آدمیوں میں کون تھا جو اُن کا شناسا نہ ہو۔ وہ خود بڑے آدمی تھے، لیکن سب بڑے آدمی آپس میں ایک دوسرے سے ایسے قریب نہیں ہوتے جیسے اُن سے قریب تھے۔ اُن کے اندر خداداد کشش تھی۔ اُن کی طرف چھوٹے بڑے سب اس طرح کھنچتے تھے جس طرح مٹھاس کی طرف چیونٹیاں کھنچتی ہیں۔

ایک دن، شام کے وقت، میں اور وہ حضرت سلطان المشائخؒ کی والدہ

حضرت بی بی زلیخا کا مزار دیکھنے گئے۔ وہ مزار کی مرمت کرا رہے تھے۔ یہ مقام بیوی نور کے نام سے مشہور ہے۔

بیوی نور مہرولی سے جہاں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مزار ہے بالکل نزدیک ہے۔ میں نے عرض کیا آیا تو ہوں۔ مولانا راشد الخیری سے ملتا چلوں مولانا مع اہل و عیال کبھی کبھی مہرولی جا کر رہا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا اچھا چلیے۔

خواجہ صاحب قطب پارک میں لاٹ کے نیچے ٹھیر گئے اور میں بستی میں مولانا سے ملنے چلا گیا۔ جب چلا ہوں تو خواجہ صاحب، اور خواجہ صاحب کے ڈرائیور شہاب الدین کے سوا ادھر ادھر آدمی کا نشان نہیں تھا۔ لیکن جب واپس پہنچا تو خواجہ صاحب کے گرد ساٹھ، ستر آدمی حلقہ کئے بیٹھے تھے۔ واپسی میں شاید بیس منٹ بھی نہ لگے ہوں گے۔ مولانا کے ہاں میں رکا نہیں۔ آواز دی اور مولانا باتیں کرتے میرے ساتھ قطب پارک آگئے۔ بیس منٹ میں آدمی چیونٹیوں کی مانند نکل پڑے۔

ایسا ہی واقعہ کشمیر کے سفر میں ہوا تھا۔ خیر اس کا حال سفر کشمیر کے موقع پر بیان کروں گا۔

اخبار نکالنے کے شوق کی داستان یہ ہے کہ ایک دن خواجہ صاحب کے والد ماجد خاندان کے درمیان تشریف فرما تھے۔ اور باتوں کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بستی حضرت سلطان المشائخ کے ایک ہندو باشندے لالہ چرنجی لعل نے چھاپہ خانہ کیا ہے اور حضرت سلطان المشائخ کا تذکرہ سیر الاولیا چھاپا ہے۔ حالانکہ یہ کام ہم وابستگان کے کرنے کا تھا۔ یہ خدمت ہم انجام دیتے، یہ ہمارا فرض تھا۔ خاندان والوں نے جواب دیا یہ کام علم سے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں

سے علم کا چرچہ جا تا رہا تو لا محالہ اب دوسری قوم کے لوگ ہماری کتابوں سے فایدہ اُٹھائیں گے۔

خواجہ صاحب موجود تھے۔ خواجہ صاحب کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ انھوں نے گفتگو سنی اور سوچا کہ بڑا ہو کر میں چھاپہ خانہ کروں گا اور ایسی کتابوں چھاپوں گا جس سے ابّا کا افسوس دور ہو جائے۔

مجلس میں لالہ فقیر چند اور مولوی سیّد احمد، مؤلف فرہنگ آصفیہ کا ذکر بھی آیا دونوں عرب سرائے کے باشندے تھے۔ عرب سرائے بستی حضرت سلطان المشائخ کے قریب تھی۔ دونوں صاحبان ڈاکٹر فیلن کی اردو لغت تیار کرانے میں شریک تھے۔

خواجہ صاحب چھاپہ خانہ اور اخبار کو سمجھ نہیں سکے۔ لیکن بس یہ عزم کر لیا کہ جو چیز میرے ابّا کے خیال میں اچھی ہے اُسے میں ضرور کروں گا۔

خواجہ صاحب لکھتے ہیں۔ میری عمر شاید سولہ برس سے کچھ ہی زیادہ ہوگی مولوی برکت اللہ صاحب کشتہ پوسٹ ماسٹر عرب سرائے نے مجھے اخبار ہمدرد مراد آباد کا ایک پرچہ دیا اور کہا اِسے دیکھو۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے بولے اخبار ہے۔ میں نہیں جانتا تھا اخبار کیا ہوتا ہے۔ میں نے ہمدرد مراد آباد کو پڑھا اور میرا جی اُس میں بہت لگا۔ اس کے بعد میں نے حامد الاخبار مراد آباد۔ انڈیا گزٹ بمبئی اور افضل الاخبار دہلی چندے بھیج کر اپنے نام جاری کرائے، اور پڑھتے پڑھتے لکھنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ انڈیا گزٹ بمبئی کے لئے سب سے پہلا مضمون "انڈیا کی نازک حالت" کے عنوان سے لکھا، جو اصلاح کے بعد چھپ گیا۔ اس مضمون کے شائع ہونے سے ایسی خوشی ہوئی جس کا اظہار ناممکن ہے۔ مگر بڑے بھائی صاحب بہت بگڑے اُنھوں نے مضمون لکھنے کے مشغلے کو بُرا بتایا۔

ایک دن جناب میر ناصر نذیر صاحب فراقؔ دہلوی جو حضرت خواجہ میر درد

رحمتہ اللہ علیہ کی یادگار ہیں اور بڑے قادر الکلام شاعر بزرگ صفت اور پابند وضع شخص ہیں۔ درگاہ شریف میں تشریف لائے۔ میرے بزرگوں سے ان کے بزرگوں سے تعلقات رہتے آئے ہیں۔ بھائی مرحوم سے ان کی گہری دوستی ہے۔ بھائی صاحب نے انھیں میرے مضمون لکھنے کا حال سُنایا، اُنھوں نے بھی کہا یہ کام مخدوش ہے۔ ایسا نہ ہو، کوئی اُلٹا سیدھا مضمون قلم سے نکل جائے اور مقدمہ قائم ہوجائے ساتھ کے ساتھ اپنی مضمون نگاری اور ایک لائبل کیس میں پھنس جانے کا قصہ بیان کر دیا۔ فراق صاحب کی باتیں عین دوستی اور اخلاص پر مبنی تھیں مگر مجھ پر قیامت آگئی۔ بھائی صاحب ڈر گئے اور نہایت سختی مضامین لکھنے کے خلاف کرنے لگے۔"

یہ اُفتاد منشی غلام نظام الدین خاکسار عالم کو معلوم ہوئی تو اُنھوں نے خواجہ صاحب سے کہا، اخباروں کے لئے فی الحال نہ لکھو، کتابیں لکھو، خاکسار صاحب نے خواجہ صاحب کو مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کے ناول دیئے اور فرمایا، ایسی عبارت لکھنے کی مشق کرو۔ ایسا لکھنا آجائے گا تو لکھنے سے روزی بھی کما سکو گے۔ خاکسار صاحب خواجہ صاحب کو دینی اور مشرقی نصیحتوں کے علاوہ معاش حاصل کرنے کے راستے بتاتے ہی رہتے تھے۔ اور خواجہ صاحب ہمیشہ اُن کا مشورہ مانتے تھے۔

خواجہ صاحب نے مولانا شرر کی تقلید میں ایک ناول لکھ ڈالا۔ لکھنؤ کے کوئی پبلشر عبدالجبار خاں تھے۔ وہ خواجہ صاحب سے خیرآباد کے عرس میں ملے۔ خواجہ صاحب نے اُن سے اپنے ناول کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا ناول مجھے بھیج دو۔ میں شائع کردونگا خواجہ صاحب نے دلی آکر خوشی خوشی ناول اُنھیں بھیجدیا۔ آٹھ دن بعد اُنکا خط پہنچا کہ ناول یہاں کسی نے پسند نہیں کیا۔ خواجہ صاحب کی ہمت ٹوٹ گئی۔ خاکسار صاحب سے کہا۔ میں کتابیں نہیں لکھ سکوں گا۔ خاکسار صاحب ہنسے اور بولے ابھی سے گھبرا گئے۔ شروع شروع میں یہی ہوا کرتا ہے۔ ہمت نہ ہارو۔ برابر لکھتے رہو۔ ایک دن

انشاء اللہ لوگ تمھاری تحریریں اصرار کرکے منگائیں گے اور تم اُنھیں لکھنوی پبلشر کی طرح روکھے جواب دو گے۔ لیکن خواجہ صاحب نے کتاب ۱۹۱۱ء تک کوئی نہیں لکھی۔ البتہ اخباروں کے لئے لکھا، بھائی کی سختی کے باوجود جاری رکھا اور انڈیا گزٹ بمبئی سے، پیسہ اخبار لاہور، اور اخبار وکیل امرتسر پہنچ گئے۔ وکیل میں پہلا مضمون جو چھپا اُس کا عنوان تھا "حلتِ زاغ" اور نیچے نام تھا، سیّد محمد علی حسن نظامی۔ اسی دوران میں شادی ہوئی۔ بھائی سے الگ گھر لے لیا اور بھائی کا دباؤ گھٹا۔ ادھر وکیل کے مالک شیخ غلام محمد نے پیرزادوں میں سے ایک نوجوان کو اُبھرتا پاکر حوصلہ افزائی کی۔ خواجہ صاحب جو لکھ بھیجتے۔ اُسے ایڈیٹر سے درست کراتے اور ضرور چھپواتے اور معاوضہ دیتے۔ شیخ غلام محمد کا تو مجھے علم ہے۔ غالباً پیسہ اخبار کے مالک مولوی محبوب عالم کا بھی یہی سلوک تھا۔

پھر خواجہ صاحب نے ماہناموں کو پکڑا۔ جو اُس زمانے میں ماہنامے نہیں کہلاتے تھے رسالے کہلاتے تھے۔ شیخ (سر) عبدالقادر کا "مخزن" بڑا معیاری اور اہم رسالہ تھا۔ مخزن نے جدید رنگ کے رسالوں کی بنیاد ڈالی تھی۔ مخزن سے پہلے نثر کے رسالے نہیں نکلتے تھے، غزلوں کے رسالے نکلتے تھے۔ انھیں گلدستہ کہا جاتا تھا۔ مخزن میں ہر کس وناکس کے مضامین نہیں چھپتے تھے۔ شمس العلماء ذکاءاللہ، قاری سرفراز حسین، مولوی اشرف حسین، پیرزادہ محمد حسین (علامہ) شیخ محمد اقبال غلام بھیک نیرنگ۔ عبدالعزیز فلک پیما۔ سیّد سجاد حیدر یلدرم۔ ناصر نذیر فراق۔ مولانا راشد الخیری۔ خوشی محمد، گورنر کشمیر۔ نذر محمد، ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز، مشتاق محمد زاہدی، مرزا محمد سعید۔ دیانرائن نگم۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور لالہ سری رام وغیرہ بلند پایہ اہل علم اور اہل قلم مخزن کے مضمون نگار تھے۔ خود شیخ عبدالقادر ہر مہینے پابندی سے لکھتے تھے۔ اِن ادیبوں کے ساتھ خواجہ صاحب کا نام آنے لگا۔ خواجہ صاحب

کا نام آنے لگا۔ خواجہ صاحب مخزن کے ابتدائی مضمون نگاروں میں تھے۔

منشی دیا نرائن نگم نے کانپور سے رسالہ زمانہ نکالا۔ منشی جنیشور پرشاد مائل نے دلی سے رسالہ "زبان" اور مولوی محمد دین نے پنڈی بہاؤالدین سے رسالہ صوفی۔ سب نے خواجہ صاحب سے قلمی امداد مانگی۔ اور بہت جلد خاکسار صاحب کی وہ پیشین گوئی پوری ہو گئی کہ "ایک دن انشاء اللہ لوگ تمھاری تحریریں اصرار کر کر کے منگائیں گے"۔

خواجہ صاحب کی رفتارِ ترقی بے حد تیز تھی۔ جن منازل اور مدارج کو دوسرے برسوں میں طے کرتے ہیں خواجہ صاحب انھیں مہینوں میں طے کر لیتے تھے۔ میں جب خواجہ صاحب سے ملا ہوں تو خواجہ صاحب کو ماہناموں سے بھی مضامین کا معاوضہ مل رہا تھا۔ صوفی پنڈی بہاؤالدین کے ایڈیٹر اور دوائے آبحیات کے مالک محمود دین الحمد اللہ ابھی بقید حیات ہیں۔ اُن کا معاوضہ مجھے یاد ہے۔ وہ فی مضمون پندرہ روپے دیا کرتے تھے اور ہر مہینے مضمون لیتے تھے۔ مضامین کی آمدنی اتنی تھی کہ تنگی ترشی سے سہی، مگر گھر کا خرچ چلتا تھا اور بھائی کے محتاج نہیں رہے تھے۔

خواجہ صاحب کے بھائی کو میں نے دیکھا ہے۔ اُن کا انتقال خواجہ صاحب کی اہلیہ اوّل کے انتقال کے بعد ہوا تھا۔ وہ نظام المشائخ کے اجراء کے وقت زندہ تھے اور نظام المشائخ کے دفتر میں آیا کرتے تھے۔ اب اُنھیں خواجہ صاحب کی مشاغل پر اعتراض نہیں تھا۔

یہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ میرے ہاں رہنے کے زمانے میں خواجہ صاحب کالج کے ایک طالب علم کی فیس دیتے تھے اور اُس کے کھانے کا خرچ اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ بھائی انتقال کر گئے تو اُن کی بیوہ اور بچوں کی بھی خدمت کی۔ آمدنی میں نذرانے ضرور شامل تھے۔ لیکن بڑا حصہ مضامین کی آمدنی کا تھا۔ نظام المشائخ

نکال کر دوسرے رسالوں، اخباروں میں لکھنا نہیں چھوڑا تھا۔

خواجہ صاحب ادبی رسالوں میں ادبی مضامین لکھتے تھے اور صوفیانہ رسالوں میں صوفیانہ مضامین۔

خواجہ صاحب نے اپنی زندگی کا مقصد مقرر کیا تھا، اسلامی تصوف کو نئے انداز سے لکھنا۔ بیان کرنا اور برتنا۔ صوفیانہ مضامین تو اس سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق لکھے جاتے ہی تھے، ادبی مضامین بھی تصوف کی چاشنی ہوتی تھی۔ تصوف کی چاشنی اور لکھنے کے انوکھے پن اور البیلے پن نے خواجہ صاحب کے مضامین کی بڑی جلدی دھوم مچا دی۔ حتیٰ کہ علامہ شبلی نے کہا کہ خواجہ صاحب سستے نہ بکئے۔ مضامین کی بجائے کتابیں لکھئے۔ مگر کُلُّ اَمرٍ، مَرھُونٌ بِاَوقَاتِھَا۔ ہر کام کا وقت مقدر ہے۔ خواجہ صاحب خاکسار صاحب کا مشورہ تو ٹال ہی گئے، علامہ شبلی کا مشورہ بھی ٹال گئے۔

مشائخ صوفیہ کا اتحاد اور خانقاہوں اور عرسوں کی اُن مراسم کی اصلاح، جو دائرہ شریعت و طریقت سے خارج ہیں، دماغ پر زیادہ چھائے ہوئے تھے اور کتاب نویسی کے لئے جیسا مسلسل اطمینان و سکون درکار ہے، وہ میسّر نہیں تھا۔

نظام المشائخ سے پہلے تصوف کے دو ماہنامے نکل نکل کر بند ہو چکے تھے۔ ایک مولوی نہال الدین احمد جلوی کا الاحسان، دوسرے مولوی عبدالحلیم شرر کا العرفان۔ ان دونوں میں تو خواجہ صاحب نے کیا لکھا ہوگا لیکن صوفی میں مدتوں لکھا۔ صوفی اور نظام المشائخ قریباً ساتھ ساتھ نکلے تھے صوفی مدتوں زندہ رہا، مگر اب بند ہے۔ اب تو اکیلا میں، سخت جان نظام المشائخ کا فقط نام لے بیٹھا ہوں، یا نظام المشائخ کی قبر کا مجاور بنا بیٹھا ہوں۔

نظام المشائخ کے بعد لاہور سے طریقت۔ پھلواری شریف ضلع پٹنہ سے انوار الصوفیہ اور میرٹھ سے اُسوۂ حسنہ نکلا تھا۔ خواجہ صاحب نے نظام المشائخ جاری کر کے نظام المشائخ کے رنگ کے پرچوں کا راستہ کھول دیا تھا۔

قلمی کتابیں جمع کرنے کا شوق

خواجہ صاحب نے کتابوں کی تصنیف و تالیف تو نہیں شروع کی لیکن کتابیں جمع کرنی شروع کر دی تھیں۔ کتابیں خواجہ صاحب آخر عمر تک جمع کرتے رہے خواجہ صاحب کی ہتیلی میں گڑھا نہیں تھا۔ خواجہ صاحب روپیہ جمع نہیں کر سکتے تھے اِدھر روپیہ آتا تھا، اُدھر خرچ ہو جاتا تھا۔ لیکن خواجہ صاحب کے ہاں سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک کے تمام اُردو رسالے جمع تھے۔ رسالوں سے کمرے بھرے پڑے تھے۔ اردو۔ فارسی اور عربی کی مطبوعہ کتابیں بھی بے شمار تھیں اور قلمی کتابوں کا ایسا نایاب اور قیمتی ذخیرہ تھا کہ ہنگامہ سنہ ۱۹۴۷ء میں خواجہ صاحب نے دلّی سے حیدرآباد۔ دکن پہنچتے ہی حافظ عزیز حسن بقائی کو لکھا کہ گھر لٹ جائے تو مجھے پرواہ نہیں ہوگی۔ لیکن میری قلمی کتابیں کسی طرح بچایئے۔ حافظ صاحب سنہ ۴۷ء میں اسپیشل مجسٹریٹ تھے۔ کانگریسی حکومت نے اختیارات کے ساتھ ریوالور جیپ کار اور کئی فوجی سپاہی اُنھیں دے رکھے تھے۔ وہ اِن ہتھیاروں سے لیس ہو کر بستی حضرت نظام الدین گئے اور کتابیں اپنے ہاں لے آئے۔ اللہ حافظ صاحب کی مغفرت فرمائے۔ اُن کا ۱۲ر اپریل سنہ ۱۹۵۷ء کو انتقال ہو گیا۔ یہ خدمت اُن ہی جیسا جری آدمی انجام دے سکتا تھا۔

حلقہ نظام المشائخ کے مقصد "درگاہوں کی اصلاح" میں خواجہ صاحب نے زنان بازاری کا ناچ گانا بند کرا دینے سے آگے کامیابی حاصل نہیں کی۔

ناچ گانا غالباً اب تک سب جگہ بند ہے۔ خواجہ صاحب کے کہنے سے نظام دکن میر عثمان علی کا تو فرمان نکل گیا تھا کہ میری مملکت کی درگاہیں ناچ گانے سے قطعی پاک رہیں۔ باقی پروگرام حلقہ نظام المشائخ کا کچھ مشائخ کی بے حسی اور عدم یکجہتی کے سبب اور کچھ حکومت انگریزی کے شبہات کی وجہ سے ٹھپ ہو گیا۔ حکومت کے شبہات کا قصہ عنقریب آتا ہے۔ لیکن ایک مقصد حلقہ نظام المشائخ کا بہ درجہ اتم پورا ہوا۔ اور وہ یہ کہ خواجہ صاحب نے تصوف کی اشاعت خوب کی اور تصوف کی متعدد نادر کتابوں کو محفوظ کر لیا۔ تصوف کی حفاظت و اشاعت حلقہ نظام المشائخ کا مقصد اول تھا۔

خواجہ صاحب کے ولولے

میں اور خواجہ صاحب تنہا ہوتے تھے تو خواجہ صاحب دو ولولوں کا اظہار اکثر کیا کرتے تھے۔ ایک تو کہتے انگریزوں سے لڑنے کو جی چاہتا ہے میدان کار زار گرم ہو۔ چاروں طرف خون بہتا نظر آئے۔ دوسرے کہتے کہ اللہ کسی طرح حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ پاک کی زیارت کرا دے

اپنی چھ برس کی عمر کا واقعہ سناتے تھے کہ میں نے پیسہ پر ملکہ وکٹوریا کی شکل دیکھ کر والدہ سے پوچھا۔ یہ کون ہے؟ والدہ نے فرمایا۔ آج کل ہم اسی کی رعایا ہیں۔ اسی کے محکوم ہیں۔ میں نے کہا۔ پیسے پر میری شکل بنوا دو۔ والدہ کا دل چونکہ اسلامی حکومت کے مٹ جانے سے بے حد متاثر تھا وہ رونے لگیں اور بولیں بیٹا اللہ تمہیں بادشاہ بنائے تو کلمہ کا پیسہ چلانا۔ مسلمانوں کے پیسے پر مورت نہیں ہوتی۔ اثر قبول کرنیوالی طبیعت تو تھی ہی، اس گفتگو سے بادشاہ بننے کا خیال دل میں سما گیا تھا۔

پھر ایک دفعہ کیا ہوا، طاق میں کسی کی چوڑیاں رکھی تھیں، خواجہ صاحب نے وہ پہن لیں۔ والدہ چلائیں۔ ارے اُتار چوڑیاں، نہیں تو امام مہدی کے ساتھ شریکِ جہاد کیسے ہو گا۔ ہاتھ سے تلوار نہیں اُٹھے گی۔ خواجہ صاحب نے چوڑیاں اُتار دیں اور دریافت کیا۔ امام مہدی کون ہیں اور جہاد کیا شے ہے؟ والدہ نے جواب دیا۔ آخر زمانے میں امام مہدی ظاہر ہوں گے اور مسلمانوں کے دشمنوں سے لڑیں گے۔ ہر مسلمان اُن کے ساتھ جہاد میں شرکت کرے گا۔ جہاد دینی جنگ کو کہتے ہیں۔ اس واقعہ نے چوڑیوں سے ایسی عداوت پیدا کر دی کہ جس عورت کے ہاتھ میں چوڑیاں نظر آئیں، توڑنے دوڑتے اور امام مہدی کا انتظار تو دمِ آخر تک رہا۔

آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں کہ تیموری شہزادوں کو بڑھاتے تھے اور اُن کی مدد سے خود بڑھتے تھے اور کنجڑے قصائی ہم مکتبوں پر حکومت کر کے حکومت کا جذبہ پورا کرتے تھے۔ حکومت کرنے میں سختیاں بھی ہو جاتی تھیں۔

خواجہ صاحب آپ بیتی میں لکھتے ہیں:۔ ایک دفعہ (اُستادِ مکتب) مولینا محمد اسمٰعیل کو میرے مظالم کی اطلاع ہو گئی۔ اُنھوں نے بہت تنبیہہ کی۔ میں نے اپنے جاسوسوں سے پوچھا۔ کس نے میری چغلی کھائی تھی۔ معلوم ہوا عرب سرائے کے دولت مند میواتی معاملہ خاں، ٹھیکہ دار کے لڑکے ابراہیم کا کام تھا۔ ابراہیم سے مقابلہ کی ہمت نہیں ہوئی۔ کیونکہ اُس کے ساتھ لڑکوں کا بڑا جتھا تھا۔ میں نے خاموشی اور صبر و ضبط سے کئی دن غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ شہزادوں کے لڑکوں سے مدد لینی چاہیئے۔ چنانچہ مرزا کالے اور مرزا اسمٰعیل وغیرہ کو لے کر مرزا غالب کے مقبرہ میں گیا اور وہاں ان شہزادوں کے سامنے تقریر کی کہ تم شہزادے ہو اور ہم پیرزادے ہیں۔ اس دہقانی میواتی نے آج میری

چغلی کھائی ہے، کل تمھاری چغلی کھائے گا۔ اِسے فوراً سزا ملنی چاہیے۔
مرزا اسمند بولے ابراہیم ہمارے ہاں کبوتر دیکھنے آتا ہے۔ میں اُسے نہیں آنے دوں گا۔ مرزا کالے نے کہا۔ میں مُرغ بازی کا تماشہ جو میرے ہاں ہوتا ہے نہیں دیکھنے دوں گا۔ میں نے کہا۔ یہ بھی کرو۔ اور یہ بھی کہ ابراہیم کے ساتھی لڑکوں سے یارانہ کرو۔ میں ناشتے کے لئے چنے کشمش لاتا ہوں۔ اُس میں سے اِن لڑکوں کو دیا کرونگا تم بھی اِنھیں کھلاؤ پلاؤ۔ جب سب لڑکے ہمارے دوست بن جائیں گے تو ابراہیم اکیلا رہ جائے گا۔ پھر ہم سب مل کر اُسے ماریں گے۔ دونوں شہزادے لڑکوں نے میری رائے مان لی۔ مگر افسوس ابراہیم میواتی کے ساتھیوں نے ہماری چیزیں کھائیں اور لڑائی کے وقت ابراہیم کے ساتھ ہو گئے۔ تب بھی ہماری جماعت کثیر تھی ہم نے غرب سرائے کے سامنے نہر کے کنارے ابراہیم اور اُس کے ساتھیوں کو شکست دی۔

اللہ شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ خواجہ صاحب نو برس کے تھے۔ اُن کے والد نے اُنھیں ترکی ٹوپی لاکر دی۔ جس کا رنگ نہایت سُرخ تھا حضرت سلطان المشائخ کی درگاہ کے پائنتی سنگ مرمر کا فرش ہے۔ فرش میں ایک پتھر سُرخی مائل ہے۔ خواجہ صاحب سُرخ ٹوپی پہنتے اور سُرخ پتھر پر بیٹھ جاتے اور ہم عمر لڑکوں سے کہتے میں تمھارا بادشاہ ہوں۔ میرے حضور دست بستہ کھڑے ہو جاؤ۔ لڑکوں میں اُن کے عزیز اور عمر میں اُن سے سال دو سال بڑے پیرزادہ محمد غوث بھی تھے۔ اُنھوں نے خواجہ صاحب کی بادشاہت تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ خواجہ صاحب نے رعایا کو حکم دیا، غوث کی گُندی کرو۔ لیکن غوث نے خواجہ صاحب کی گُندی کر ڈالی، خواجہ صاحب لہو لہان ہو گئے۔

دوسرا ہوتا تو دوبارہ بادشاہت کا نام نہ لیتا۔ مگر خواجہ صاحب نے

دوسرے روز غوث پر پھر زور ڈالا کہ مجھے بادشاہ تسلیم کرلو۔ ورنہ میں آج بھی لڑونگا۔ غوث خواجہ صاحب نہیں تھے، یا غوث نے سمجھداری برتی اور خواجہ صاحب کو بادشاہ تسلیم کرلیا۔

خواجہ صاحب نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ میری قوم کے اندر بھی فاتح بننے اور حکومت کرنے کا مادہ موجود ہوتا تو میں اپنی جبلی خواہش اور قوم کے مادہ کو ضایع نہ جانے دیتا اور قطعی کہیں نہ کہیں کا بادشاہ ہوجاتا۔

خواجہ صاحب جب مجھ سے اس قسم کی باتیں کرتے تھے تو میں بُت بنا بیٹھا رہتا تھا اور تحریروں میں اس نوع کے اشارے آتے تھے تو بھی خاک نہیں سمجھتا تھا لیکن اب میرا خیال ہے کہ یہ سب اُن کی والدہ کے دل کی آوازیں تھیں جو اُن کے دل میں اتر گئی تھیں، نیز اُس عظمت کی نشانیاں تھیں جو اُنھیں ملنے والی تھی۔

خواجہ صاحب کی تصویر روپے، پیسے پر تو نہیں چھپ سکی مگر خواجہ صاحب کا نام دلوں پر نقش ہوگیا چھوٹے، موٹے بادشاہوں سے وہ ویسے بھی بازی لے گئے اور بڑے بادشاہ ہی کیا ہیں۔ بادشاہوں کے نام تاریخوں میں دب جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کا نام انشاء اللہ اُبھرا رہے گا اور خسرو اقلیم سخن امیر خسرو کے ساتھ لیا جائے گا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

خواجہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ ولولہ اٹھارہ سال کی عمر تک بہت زیادہ تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں شادی ہوئی اور میرے بھائی اور میری بیوی کے بھائی کے چونکہ لڑائی جھگڑے رہتے تھے، خاکسار صاحب کے مشورے سے مجھے الگ گھر لینا پڑا۔ درگاہ کی آمدنی چھوڑ ہی رکھی تھی۔ بھائی کی امداد سے بھی

محروم ہوگیا۔ نون۔ تیل۔ لکڑی کی فکر نے یہ ولولہ کم کردیا۔

مصر وشام وحجاز کا سفر

رسالہ نظام المشائخ جولائی ۱۹۰۹ء میں نکلا تھا۔ دسمبر ۱۹۰۹ء یا جنوری ۱۹۱۰ء میں نظام المشائخ کا دفتر میرے ہاں آگیا۔ ۱۹۱۰ء خواجہ صاحب نے اس ارمان میں گزارا کہ مدینہ منورہ حاضری ہوجائے۔

مئی ۱۹۱۱ء میں بھیا احسان الحق کی شادی تھی۔ خواجہ صاحب کا اور میرا بلاوا پہنچا اور ہم دونوں میرٹھ گئے۔ ایکدن میرٹھ کی قیام گاہ میں بیٹھے تھے کہ محمد انوار ہاشمی سابق مالک وایڈیٹر رسالہ دین ودنیا، کے چھوٹے بھائی محمد سعید، جواب تو بوڑھے ہیں۔ مگر اُس وقت بچے تھے، نظر آئے۔ سعید حافظ ہوچکے تھے۔ خواجہ صاحب نے اُن سے کہا۔ کوئی رکوع سناؤ۔ معصوم حافظ نے سورہ لقمان کا آخری رکوع شروع کردیا جس میں ارشاد ہے کہ ہم نے تیرے واسطے جہاز کو مسخر کیا تاکہ تو اپنے پروردگار کی نشانیاں دیکھے۔ خواجہ صاحب پر مدینہ منورہ کا خیال ہمہ وقت طاری رہتا تھا اور اکثر اس کے تذکرے ہوتے تھے۔ میری نگاہ بھی خواجہ صاحب کی طرف اُٹھ گئی۔ مگر خواجہ صاحب بالکل ایسا سمجھے کہ گویا مدینہ منورہ جانے کا حکم مل گیا۔

رکوع کے ایک حصہ میں طوفان کا بھی ذکر ہے لیکن ساتھ ہی صبار وشکور کے خطابات سے تسلی دے دی ہے۔

دلی آکر خواجہ صاحب نے سفر کا تہیہ کرلیا۔ بٹوے میں فقط پچاس، ساٹھ روپے تھے، مگر ۲۰ مئی کو براہ اجمیر شریف بمبئی روانہ ہوگئے۔

اجمیر شریف میں خواجہ صاحب نے پہلی منزل کی۔ درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمیں حاضری دی۔ دیوان صاحب درگاہ سے ملے۔ سیّد

امام الدین دیوان یعنی سجادہ نشین تھے۔ اُنھوں نے اپنا وہ لباس عطا فرمایا، جسے حاضریِ آستانہ کے وقت استعمال کیا کرتے تھے۔ اور کہا کہ "جہاں جاتے ہو، فقر کی اصلی شان وہیں ہے۔ اس ملک میں اب کیا دھرا ہے۔ اپنا کام جرأت و مستعدی سے کئے جاؤ۔ مخالفوں سے مت ڈرو۔ سب کام کرنے والے مخالفت کا شکار ہوتے ہیں۔ میں تمھاری کامیابی کی دعا کرتا رہونگا۔"

دیوان صاحب بھی مخالفوں کے بہکائے میں آچکے تھے۔ لیکن اِس سفر کی برکت نے اُن کا خیال بدل دیا تھا۔ بلکہ مستقل مخالفوں کے قلوب کدورت سے صاف کر دیئے تھے۔ خواجہ صاحب درگاہ حضرت سلطان المشائخ کو سلام کر کے چلے ہیں تو اہلِ خاندان اور اہلِ درگاہ نے بغلگیر ہو کر اور رو، رو کر انھیں رخصت کیا تھا۔

خواجہ صاحب خیریت نامے کے ساتھ مجھے تاریخ وار حالات سفر بھیجتے تھے۔ میں وہ حالات نظام المشائخ میں شائع کرتا تھا۔ پورا سفرنامہ نظام المشائخ میں شائع ہوا۔ اور پھر کتابی صورت میں چھپا۔ اسی سفرنامے سے سفر کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں۔ مکمل سفرنامہ کتاب ہذا کے قریباً تین سو چوراسی صفحوں کے برابر ہے۔

۲۲ مئی ۱۹۱۱ء کے روزنامچے میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں: "صبح آٹھ بجے کے قریب گاڑی چتوڑ گڑھ کے مشہور قلعے کے پاس سے گزری۔ بلند پہاڑ پر شاندار قلعے کے آثار نظر آئے۔ میدان بھی سامنے تھا۔ میں اُسے دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ یہ وہی میدانِ کارزار ہے جہاں میرے دینی بھائیوں نے تیر و شمشیر کے زور سے، شہ زوروں کے منہ پھیر دیئے تھے۔ کٹ گئے تھے اور کاٹ ڈالا تھا۔

عالمِ خیال میں برچھیوں کی نوکیں دشمنوں کے سینوں سے ٹکرا رہی تھیں کہ ایک

نہایت کرخت اور ناگوار آواز پلیٹ فارم سے آئی جس نے دو لہ خیز تصور کو درہم برہم کر دیا۔ آواز تھی "چبینا مٹھائی"۔ ایک میلا کچیلا حلوائی، جس نے دھوتی کے پچھلے حصہ کو اس بد سلیقگی سے اڑسا تھا کہ آدھے گز کے قریب کپڑے کا گچھا دم کی مانند اوپر نکلا ہوا تھا۔ حلوائی چلنے میں نیچے کے جسم کو اس طرح حرکت دیتا تھا کہ وہ کپڑے کا گچھا اگت بھرتا معلوم ہوتا تھا۔ زبان سے کہتا جاتا تھا۔ چبینا مٹھائی۔ یعنی اپنی مٹھائی کی تعریف کرتا تھا، کہ چنوں کی طرح چبانے اور پھانک لینے کے قابل ہے" گویا مٹھائی کی یہ سب سے اچھی مدح سرائی تھی۔

میں نے دلی چھوڑی تو فالسوں کا موسم تھا۔ بیچنے والے آواز لگاتے تھے "سانولے سلونے شربت کو" چتوڑ میں اچھی چیز کو بری چیز سے مشابہت دیئے سنا مسلمان جہاں گئے، انھوں نے ہر بات میں رنگ پیدا کر دیا۔ چتوڑ میں بھی مسلمان کچھ دن رہ جاتے تو آج میرے کانوں کو یہ صدمہ نہ اٹھانا پڑتا۔"

اجمیر شریف کے بعد خواجہ صاحب نے جو بیس گھنٹے جاورہ میں بابو فخرالدین کے مکان پر قیام کیا۔ وہاں سے سیدھے بمبئی پہونچے۔

بابو فتح محمد اور بابو حبیب اللہ جالندھر کے دو ٹھیکیدار تھے، جو انبالہ کے میر نیرنگ کی مثل ہمارے ہاں ہر مہینے آیا کرتے تھے۔ میر نیرنگ تو خواجہ صاحب کو دلی سے رخصت کرنے تشریف لائے۔ بابو فتح محمد اور بابو حبیب اللہ کو خواجہ صاحب نے چلتے وقت خط لکھا۔ خواجہ صاحب کے بمبئی پہنچنے سے پہلے بابو فتح محمد کا منی آرڈر خواجہ صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ بابو فتح محمد نے اتنا روپیہ بھیجدیا کہ خواجہ صاحب نے پروگرام بنایا کہ اول مصر جاؤں گا اور وہاں کے مزاروں اور خانقاہوں کی زیارت کر کے بیت المقدس ہوتا ہوا۔ حج کے موقع پر مدینہ منورہ حاضر ہوں گا۔

بمبئی کے متعلق خواجہ صاحب لکھتے ہیں :- "سوائے چند مستثنےٰ لوگوں

کے اس شہر میں سب کو میں نے بے مروت ۔ طوطا چشم ۔ خود غرض اور مطلبی پایا ۔ روشن خیالی اور احساس قومی نام کو نہیں ہے ۔ کہیں اس کا اظہار ہوتا بھی ہے تو محض نام و نمود کے لئے ۔ میں نے بمبئی میں زیادہ وقت مولوی محمد یوسف کھنکھٹے کے ساتھ گزارا ۔ مولوی صاحب ، مولوی بھی ہیں ، اور ایم ۔ اے بھی ہیں ۔ کبھی کبھی مولانا شبلی کے پاس جا بیٹھتا تھا ۔ جو اتفاق سے بمبئی میں موجود تھے ، دور وزیر ترکی قونصل جنرل جعفر بے سے معرکۃ الآرا ملاقاتیں رہیں ۔ دو ۔ دو گھنٹے ترکی کے متعلق اور اسلامی و درویشی امور پر مباحثے ہوئے ۔ جعفر بے اپنی ہر بات کی تائید میں ایک دو حدیثیں بحوالہ کتاب ضرور پڑھتے تھے ، اُنھوں نے مجھے بتایا کہ مملکت ترکی میں رفاعی ۔ قادری نقشبندی اور مولوی سلاسل کے مشائخ بکثرت ہیں ۔ مگر وہاں بھی بعض مشائخ بے علمی کے سبب پستی و زبوں کا شکار ہیں ۔ میں نے کُک کمپنی کی معرفت تین سو چھپتر روپے میں سویز تک کا اوّل درجے کا ٹکٹ لیا ۔"

خواجہ صاحب کو جہاز میں چکر نہیں آئے ۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں " اگر تم سمندر کی بیماری سے محفوظ رہنا چاہتے ہو تو اپنی کسی پیاری چیز کا تصور کر کے بیٹھ جاؤ اور اُس میں ہمہ تن محو ہو جاؤ ۔ دین دنیا کی راحت خیال کی یکسوئی میں ہے "

۵ ؍ جون کے روزنامچے میں لکھتے ہیں ۔۔۔ " جی گھبرایا تو چھتری پر چلا گیا ۔ فرسٹ کلاس کی ہر چیز اعلیٰ ہے ۔ فرسٹ کلاس کیا ہے ۔ شداد کی بہشت کا ایک ٹکڑا ہے ۔ چھتری پر انگریز ڈیکا جمگھٹا کھیل میں مصروف تھا ۔ میں ایک مخملی کوچ پر بیٹھ گیا ۔ ایک پارسی ۔ ایک فرانسیسی سے شطرنج کھیل رہا تھا ۔ پارسی کے مہرے سیاہ تھے فرانسیسی کے سفید ۔ میں نے دیکھا کہ سفید مہرے سیاہ مہروں پر چھائے جاتے ہیں بے ساختہ کہہ اٹھا ۔ فرزیں کو بچاؤ ۔ فرانسیسی فارسی جانتا تھا ۔ بولا ۔ آپ آئیے ! میں دس برس سے شطرنج کا تارک ۔ ذرا ہچکچایا ۔ مگر فرانسیسی نے اصرار کیا

مجبوراً مقابلے میں اُترنا پڑا۔

میدان ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بساط میں کامل ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں تھا۔ لشکر بے قاعدگی سے حرکت کر رہا تھا اور حریف بڑی دانائی سے مورچوں پر چھایا ہوا چلا آتا تھا۔

میں نے اَلحَربُ خُدعَۃٌ پر عمل کیا۔ دانستہ رُخ کو پیدل کے منہ میں دے دیا۔ فرانسیسی نے رُخ کو مار لیا اور مجھے ناتجربہ کار سمجھ کر مطمئن ہو گیا۔

غنیم کا شاہ میسرہ کے قلعہ میں بالکل محفوظ تھا۔ میں نے میمنہ کی طرف اپنا لشکر بڑھایا تاکہ حریف اُدھر جھکے اور میسرہ کا قلعہ ٹوٹ جائے۔ جونہی میمنہ کی جانب میری یورش دیکھی حریف اپنے سب مہروں کو ترتیب کے ساتھ نکالتا ہوا اُدھر جھک آیا اور قلعۂ شاہ میں چند رخنے پڑ گئے۔ یہی میں چاہتا تھا۔ فوراً دو دو گھوڑے معرکے سے جدا کئے اور اُنھیں شاہ کی طرف جھونک دیا۔ دو پیدل بھی قدم بڑھا کر گھوڑوں کے سہارے قریب پہونچ گئے۔

اب دشمن سمجھا اور غضبناک ہو کر قلعہ کی طرف پلٹا۔ مگر یہاں کام ہو چکا تھا۔ گھوڑے فصیل کود کر شاہ کو محاصرے میں لے چکے تھے اور پیدل کی ایک چال پر قسمت کا فیصلہ رہ گیا تھا۔ حریف سے اور چال بن نہ آئی۔ فرزیں کو قربان گاہ بھیج دیا یعنی ایسے موقع پر اُس کی شہ دی کہ میں آسانی سے اُسے مار سکتا تھا۔ لیکن ایک ہی چال کے ہیر پھیر میں اور کا نقشہ بگڑ جاتا، اس لئے کھٹا چھنی سے درگزری، اور شہ بچا کر فرزیں کو چھوڑ دیا۔ غنیم نے ایک اور جنبش کی اور میرے نقشے کو بگاڑنا چاہا مگر وقت آ لگا تھا۔ پیدل نے آگے بڑھ کر شہ دی۔ فرانسیسی مات کھا گیا۔ ایک بلجیم نے کہا۔ میں روپے پیسے کی شرط لگا کر کھیلتا ہوں۔ میں نے جواب دیا۔ جوا اسلام میں حرام ہے۔ اور اُٹھ کر اپنے کیبن میں چلا آیا۔

خواجہ صاحب کا فرانسیسی کے مقابلہ میں ہندستانی کی مدد پر آمادہ ہو جانا اور فرانسیسی سے شطرنج اس جوش کے ساتھ کھیلنا۔ جیسے سچ مچ میدانِ جنگ میں جنگ کر رہے ہیں۔ پھر جنگ کا حال مزے لے لے کر بیان فرمانا یہ باتیں فقط ادبی ذوق ہی کا پتہ نہیں دیتیں، کسی اور ذوق کا بھی پتہ دیتی ہیں۔

سفرنامے کے تمام اقتباسات خواجہ صاحب کی طبیعت کے رجحانوں کو بتائیں گے۔

۶ر جون کے روزنامچے کا ایک فقرہ ہے:۔ "جہالت اور پست ہمتی نے ہمیں یورپ کے گھوڑوں کے پیروں میں روندنے کی گھاس بنا دیا ہے۔" آگے لکھتے ہیں:۔ "میں، اگرچہ سارے جہاز میں اکیلا ہوں۔ مگر ان سفید رنگ والوں سے دب کر نہیں رہتا۔ وہ تو مجھے چٹکیوں میں اڑا دیتے، اگر میں بے باکی سے کام نہ لیتا۔" آج ہی کا واقعہ ہے۔ جہاز کے ڈاکٹر نے میرے قریب آکر میرے کرتے کو گریبان کے پاس سے پکڑا اور کچھ آسٹرین زبان میں کہا۔ عورت مرد کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ میں نے ڈاکٹر کے کوٹ کو وہیں گریبان کے پاس سے پکڑ کے کہا۔ خبیث اپنی آنکھ کا شہتیر بھی تو دیکھ۔ یہ کہہ کر میں ہنسا۔ ڈاکٹر نے اور سب مجمع نے کھسیانی ہنسی میں بات ٹال دی۔ شطرنج والے فارسی داں فرانسیسی نے کہا "در فہم جنابِ عالی گفتارِ ڈاکٹر نیامدہ۔ او گفت کہ لباس حضرت بسیار سرد است"۔ میں نے جواب دیا "پہلے من گمان دارم کہ ڈاکٹر صاحب نیز گفتارم را در گوش ہوش نیاوردند من بجواب شاں گفتہ بودم کہ لباس شما خیلے گرم است"۔

عدن کی بابت لکھتے ہیں:۔ "اگر دنیا میں کوئی ایسا شہر ہے جہاں درخت اور گھاس کی پتی تک نظر نہ آتی ہو تو وہ عدن ہے۔"

۸ر جون کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔ پردیس میں ہندو مسلمان کا امتیاز

اُٹھ جاتا ہے۔ کاش دیس میں بھی آپس کا یہی سلوک ہوتا۔

۸ جون :۔ " اب صرف دو دو روز سو تو بہنچے میں رہ گئے ہیں۔ یہ خاک نژاد آدمی پانی سے کتنی جلدی سیر ہو جاتا ہے۔ بار بار زمین پر چلنے کی حسرت ہوتی ہے۔

۱۳ جون :۔ " اس کے بعد ایک صاحب کھمبایت کے رہنے والے عبد الکریم نامی سے ملاقات ہو گئی جو قاہرہ میں مدت سے تجارت کرتے ہیں۔ اُن کو ساتھ لے کر (ترجمانی کے خیال سے) مصر کے مشہور شیخ المشایخ سید توفیق بکری کی کی زیارت کرنے گیا جو بڑی شیخ الاسلام کا سا درجہ رکھتے ہیں اور تمام مشایخ مصر کا مرکز ہیں۔ چاروں طرف سنہری کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ حضرت الشیخ نے ہندو۔ مسلمان۔ عورت۔ مرد علما و مشایخ ہر طبقے اور فرقے کے حالات پوچھے ان کی تعلیمی۔ تجارتی۔ تمدنی کیفیت دریافت کرتے رہے "

۱۳ جون کے روزنامچے میں ہے :۔ مصری عورتیں منہ پر ایک سیاہ کپڑا باندھ لیتی ہیں، جس میں تھوڑی سی ناک بھی ڈھکی رہتی ہے۔ باقی آنکھوں اور اُن کے نیچے اوپر کے حصہ کو نشانہ بازی کے لیے کھلا رکھتی ہیں۔ یہ سیاہ کپڑا اس قدر باریک ہوتا ہے کہ ہونٹوں کی سُرخی صاف جھلکتی نظر آتی ہے، گویا دکھاتی ہیں کہ پتلے ابر میں چاند ایسا ہوتا ہے اور آسمان میں چاند کی بہار دیکھنی ہو تو ذرا نگاہ تھوڑی سی اور اوپر کر لو اور دیکھ لو۔

آنکھیں ایک تو ہوتی ہی ہیں عموماً سیاہ اُس پر سُرمے کی سان۔ پلکوں کی نوک کو اور تیز کر دیتی ہے۔ اندر ایک سایہ سا ہوتا ہے جس کے اوپر سیاہ ریشمی چادر سجا کر چلتی ہیں تو چمکتی ہوئی، چادر کو دانستہ پھسلاتی ہوئی اور بناوٹی گھبراہٹ سے اِدھر اُدھر دیکھ کر اُسے سنبھلتی ہوئی۔ نوجوان اس تماشے کی آرزو میں جگہ جگہ بچوں پر موجود رہتے ہیں۔

سبز گھاس پر جا کر تو اُن کی اٹھکیلیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں۔ دوڑتی ہیں، ایک دوسری سے اُلجھتی ہیں، ہنستی ہیں اور زمین کی طرف جُھکی پڑتی ہیں، گویا نشے میں بے قابو ہیں۔ یا گھاس کترنے کی قینچی ہیں جس کو یورپ کا تمدن چلا رہا ہے اور گھاس کے ساتھ ایمان اور تقدس کے بے خطا پودوں کو بھی کترتا چلا جاتا ہے۔

اگر مسلمانانِ مصر کی ترقی کا معیار یہی ہے۔ اگر انگریزی تعلیم و تربیت کا انجام کار یہی چشم نواز نظارہ ہے تو ہندوستان کے مذہبی خیال والے اپنی نئی تعلیمیافتہ جماعت کے انجام کار کو ابھی سے ذہن نشین کر لیں اور ہو سکے تو اپنی قدیمی غیرت و شرافت کو کسی ایسے بکس میں بند کر دیں جسے موسمی ہوا نقصان نہ پہنچانے پائے ورنہ عین مستی شباب میں یہ خونخوار چیزیں نکل پڑیں تو کائناتِ تمدن کو زیر و زبر کر ڈالیں گی۔"

۱۴ جون: "دوپہر کو حسب وعدہ سید البکری کے پاس گیا اور کھانا کھایا۔ یہاں مشائخ بھی میز کرسی پر کھاتے ہیں۔ حضرت الشیخ نے مصر کے اکثر مشہور کھانے تیار کرائے تھے۔ کھانوں میں دُنبہ کی ثابت ران اور شہد کے پراٹھے بہت لذیذ تھے، پراٹھوں میں شہد ایسا پیوست تھا کہ اوپر نظر نہیں آتا تھا۔ منہ میں نوالہ رکھنے سے اُس کا گھونٹ جدا ہو جاتا تھا۔

کھانے کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔ آریہ سماج کی کیفیت حضرت الشیخ نے بہت غور سے اور جرح کر کے سُنی۔

حضرت الشیخ کے ہاں سے جامع ازہر آیا۔ اللہ اکبر، یہ وہی شہرہ آفاق مقام ہے جس کا نام بچپن سے کانوں میں گونجتا رہا ہے۔ بدقسمتی سے لمبی تعطیل کا زمانہ تھا۔ طلبہ اپنے اپنے وطن چلے گئے ہیں، پھر بھی ہزار پانسو طلبہ موجود تھے۔ درس کا وقت نہ تھا۔ متفرق گردہ سبق کی تکرار کر رہے تھے۔

اس کے بعد مصر کے ایک مشہور محبِّ وطن محمود بے سالم (بیرسٹر) سے ملا بیدار مغز شخص ہے۔ ہفتہ کی شام کو مدعو کیا ہے، اُس دن مفصل بات چیت ہوگی۔
مصر کے سقّے بھی دلّی کے سقّوں کی طرح کٹورے بجاتے اور پانی بلاتے ہیں نیز یہاں کے سودے والے بھی آواز لگا کر سودا بیچتے ہیں۔ میں نے یہاں کوئی لاغر اندام نہیں دیکھا۔"

۱۵ سے ۲۱ جون تک :۔ "اس ہفتہ میں اکثر سرِ مبارک سیّدنا امام حسین علیہ السّلام کے مزار پر حاضری دی۔ ایک روز اپنی فریاد لکھ کر لے گیا تھا ظہر کی نماز کے بعد مزارِ مبارک کے پہلو میں کھڑے ہو کر عرض کیا :۔

ابن رسول اللہ کو سلام۔ بنتِ رسول ؐ کے لختِ جگر کو سلام کربلا کی خاک میں کٹ گرنے والے سر کو سلام!

وہ سر جس پر زلفیں لٹکتی تھیں اور جس پر عمامۂ امامت باندھا جاتا تھا۔ وہی سر جس میں رُخِ انورِ رسالت مآب سے مشابہ ایک شکل تھی۔ اُس شکل میں نورِ ہدایت برسانے والی آنکھیں تھیں اور وہ لب تھے جنھیں سیدالعرب والعجم ؐ چوما کرتے تھے۔

اے پیاسی زبان اور خشک حلقوم والے سر! جس اُمت کی خاطر تیرا یہ حال ہوا، آج وہ سارے جہان میں شکستہ حال ہے بھوکی ہے، پیاسی ہے۔ حقیر ہے۔ ذلیل ہے۔ اسی کے چند افراد ہند میں ہیں، اُن سب غریبوں کا سلام لے کر حاضر ہوا ہوں قبول کر!

اے بارگاہ الٰہی میں سب سے زیادہ مقبول۔ سب سے زیادہ محبوب!

اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں مقدس و مطہر مقام میں کھڑا ہوں!

یہ وہ جگہ ہے، جس سے ایک گز کے فاصلے پر حسین ابن فاطمۃ الزہرا کا مقتول سر دفن ہے لہٰذا، اس جگہ کا واسطہ دیکر درخواست کرتا ہوں کہ میری عاجزانہ دعا کو قبول فرما۔

اس ہفتہ میں مصر کی اور تاریخی چیزیں بھی دیکھیں۔ مثلاً اہرام۔ ابو الہول حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فاتح مصر کی مسجد۔ سلطان حسن کی مسجد اور، اور مسجدیں۔ حضرت سیدہ زینبؓ ہمشیرہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا مقبرہ اور خاندان نبوت کی دو اور شہزادیوں سیدہ نفیسہؓ سیدہ عائشہؓ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مزارات۔

فرعون موسیٰ کی لاش کو بھی دیکھا، جس کی بابت قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ آج ہم تجھ کو تیرے بدن کے ساتھ محفوظ کیے دیتے ہیں تاکہ تو اُن لوگوں کے لئے جو تیرے بعد دنیا میں آئیں گے (عبرت کی) نشانی ہو۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً۔

میں نے فرعون سے خطاب کیا۔ جی اُٹھ فرعون! آجکل ہوٹل میں چل کر وھسکی کا ایک جام پئیں اور دیکھیں کہ اس مصر میں کتنے کوٹ پتلون والے تیری طرح سرکشی کے جذبات سے سرشار جوتیاں کھٹکھٹاتے پھر رہے ہیں۔

بانی فرقہ بابی کے بیٹے عبد البہا۔ زبیر پاشا، سابق بادشاہ سوڈان سے عبد العزیز شاویش جرجی زیدان اور ایڈیٹر صاحب المنار سے ملاقات کی۔ میں گھاس سی کاٹ رہا ہوں

۳۰۔ جون :۔ آج صبح قاہرہ سے رخصت ہوئے۔ ڈیڑھ گھنٹے میں طنطا پہنچے۔ یہاں حضرت سیدی بدوی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ جن کا رتبہ ان ممالک میں حضرت خواجہ اجمیری کا سا مانا جاتا ہے۔ شیخ سنوسی ان ہی کے سلسلہ

میں ہیں۔ میں حضرت سیدی احمد کے مزار پر حاضر ہوا۔ اور درگاہ کے سجادہ نشین سے ملا۔ انھوں نے اپنے سلسلہ قادریہ شاذلیہ، احمدیہ وغیرہ جمیع سلاسل میں بیعت لینے کی اجازت دی۔

یکم جولائی کو اسکندریہ میں حضرت دانیال پیغمبر اور حضرت لقمان حکیم اور قصیدۂ بردہ کے مصنف امام بوصیریؒ کے مزاروں پر حاضر ہوئے۔

مصر کے ترجمانوں کے متعلق خواجہ صاحب لکھتے ہیں۔ ترجمان نے حسب عادت کلکل کی۔ لیکن کلکل کے بعد سارٹیفکٹ مانگا۔ میں نے اس کی کتاب پر ایک سطر لکھدی کہ " یہ ترجمان لوگ خدا کی تقدیر ہیں، جس کا حال کسی کو معلوم نہیں۔"

پورٹ سعید اور یافہ میں جھانکی مارتے بیت المقدس کی ریل میں سوار ہوئے راستہ بڑا سرسبز ہے۔ بیت المقدس پہنچ کر وہاں قیام کیا جہاں کبھی حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے چلہ کھینچا تھا جو اس چلے یا تکیے کے قریب ہے۔ گنبد صخرہ شریف گئے۔ مسجد اقصیٰ کی زیارت کی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مسجد آج کل بند ہے۔ کیونکہ چند انگریزوں نے مخفی گڑھا کھود کر مسجد سے تبرکات چرالئے ہیں مقدمہ چل رہا ہے۔ تا اختتام مقدمہ مسجد بند رہے گی۔

آثار قدس کی زیارت کر کے عیسائیوں کا گرجا دیکھا۔ جہاں ایک قبر کو بتایا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی قبر ہے۔ گرجا کا دربان مسلمان ہے۔ کنجی اسی کے پاس رہتی ہے۔ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے سے اس گرجا کی کنجی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ حضرت مریمؑ کا مزار بھی یہیں ہے۔ انگریزوں کے سوا بیت المقدس میں ہر قوم اور ہر فرقے کے عیسائیوں کے الگ الگ گرجا ہیں ایک کے گرجا میں دوسرا نہیں جاتا۔ لیکن اس بڑے گرجا میں جہاں تمام عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت مسیح کو صلیب دی گئی تھی اور ان کی قبر بنائی گئی تھی۔

سب عیسائی آتے ہیں۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح یہاں تین دن دفن رہے تھے اور یہیں سے آسمان پر اٹھائے گئے تھے۔

۶ر جولائی کو محراب حضرت زکریا علیہ السلام میں بیٹھ کر یہ دعا پڑھی:۔

زکریا کے رب! اپنے بندے کی ندا کو رحمت سے سننے والے اللہ! جب زکریاؑ نے اس محراب میں بیٹھ کر تجھ سے کچھ مانگا، تو تیرے قول کے مطابق چپکے سے مانگا۔ جسے تو نے سنا اور زکریاؑ کے دامنِ مراد کو گوہرِ مقصود سے بھر دیا ــــ تبا کہ میں ندائے خفی سے پکاروں یا صدائے جہر لگاؤں؟ زکریاؑ عمر میں بوڑھے تھے، میں قویٰ کے اعتبار سے ضعیف ہوں، زکریاؑ کو اپنی بیوی کے بانجھ ہونے کی شکایت تھی اور مجھے اپنی قوم کے بانجھ ہو جانے کا شکوہ ہے۔ میری قوم سے نمو کی صفت مفقود ہو گئی ہے۔ زکریاؑ ایک وارث کے آرزو مند تھے جو آلِ یعقوبؑ کے ورثہ کو برقرار رکھے اور خاندان کا نام روشن کرے۔ زکریاؑ اپنے دیگر قرابت داروں سے ڈرتے تھے کہ ولی حقدار نہ ہونے کے سبب کہیں وہ بزرگوں کے طریقے کو برباد نہ کر دیں ــــ میں بھی اے اللہ! وارث کا طلبگار ہوں، جو اسلام کے ورثے کو قائم رکھے اور بڑھائے مجھے بھی نااہل اہلِ طریقت سے وہی ڈر ہے جو زکریاؑ کو تھا۔ زکریاؑ کو اپنی دعا کے مقبول ہونے کا یقین تھا۔ میرا بھی ایمان ہے کہ تو میری دعا رد نہیں کرے گا۔ تو بس جلدی وار داتِ غیب میں سے کچھ میرے دل پر وارد کر!

تو نے زکریاؑ کو فرزند کی بشارت دی۔ اُس کا نام بھی خود رکھا

میرے لئے کیا ارشاد ہے؟ معنوی فرزند کا متمنی ہوں۔ مگر نام مجید سے نہیں رکھواؤں گا۔ تیرے مقبول پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کا رکھا ہوا نام مُسلِمُ کافی ہے۔

برکت والی زمین۔ مقبول محراب، صاحب الاحترام مسجد سب آمین کہو آج میں اپنے رب کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ بیٹا مانگتا ہوں نسبی نہیں، روحانی۔ صُلبی نہیں، قلبی۔ ایسا کہ دنیا میں میری خواہش کے موافق، خوشی اور راحت پھیلائے۔

اے رب! اس محراب میں دعا کرنے والے زکریاؑ کو کفار نے آرے سے چیر ڈالا تھا اور تیری عطا کی ہوئی نعمت یحییٰؑ کو خاک و خون میں ملا دیا تھا۔ میں اس سے پناہ مانگتا ہوں۔ میرا فرزند میدانوں میں للکارنے والا ہو۔ توپ کی گاڑیوں سے کھیلے، آتش بار گولوں کو اچھالتا پھرے۔ جرأت دین اُسے گرمائے۔ رأفت مخت اس کی بات کو نرملائے، حق سے خوش ہوتا ہو، ناحق سے گھبراتا ہو۔ الحاد و دہریت کی کیاں کھینچنے والا۔ جہل و توہم کی مرمت۔ تساہل و کاہلی کا پیام اجل آگے بڑھنے والا اور بڑھانے والا۔ جاگنے والا اور جگانے والا!

۷ رجولائی کو قدس کے قاضی سے اُن کی عدالت میں ملا۔ چاروں طرف قرآن پاک کی اِس قسم کی آیتیں لکھی ہوئی تھیں۔ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى۔ یعنی لوگوں کا فیصلہ حق اور انصاف کے ساتھ کرو جس میں ذاتی تعلقات اور ذاتی کدورت کا دخل نہ ہو۔ فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اگر تمہیں معاملات کی حقیقت کی خبر نہ ہو تو باخبر لوگوں سے دریافت کرو۔

مسجد اقصیٰ میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ مسجد کے بلند منارہ پر نماز سے پہلے ایک قاری زوردار آواز سے تلاوتِ کلامِ مجید کر رہا تھا اور نعتِ رسولؐ بھی پڑھتا جاتا تھا اور کلامِ خدا اور ذکرِ رسولؐ قدس کے تمام گرجاؤں پہ چھا رہا تھا۔

۸۔ جولائی کو قصبہ خلیل الرحمٰن میں حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ۔ حضرت یعقوبؑ۔ حضرت یوسفؑ اور حضرت اسحٰقؑ جیسے جلیل القدر نبیوں کے مزارات پر حاضری دی اور حضرت سلیمانؑ کی دیوار دیکھی۔ قصبہ خلیل الرحمٰن قدس سے بتیس میل دور ہے۔

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السّلام سے عرض کیا:۔

یا جدّ الکل! گورے۔ کالے۔ عیسائی۔ موسائی۔ مسلمان سب کے دادا جان! میں تم پر قربان۔ جن ستاروں اور آفتاب و ماہتاب کو دیکھ کر آپ نے فراستِ نبوت سے اللہ کو پہچانا تھا، اُن سے بڑھ کر آجکل سائنس کے آفتاب و ماہتاب درخشانی دکھا رہے ہیں اور آپ کے دینِ حنیف کے معتقد نبوی فراست کے موجود نہ ہونے کے سبب گمراہ ہوئے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ برق، یہ بھاپ۔ یہ طاقتیں بس یہی خدا ہیں۔ آپ نے سورج، چاند کو غروب ہوتے دیکھا، اور اس سے نتیجہ نکالا کہ ڈھلنے والی اور زوال پذیر شے خدا نہیں ہو سکتی۔ مگر آجکل دن کے زوال کو اور بے اختیاری کو دیکھ کر عقاید کی اصلاح نہیں ہو رہی۔

اے مقدس باپ! اب نبوی تجلّی کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ پروردگار سے کہیئے کہ وہ نعاتِ رسالتِ محمدیہ سے کوئی چمکارا جلد ظاہر فرمائے اور آپ کے اس دین کو محفوظ کر دے جس میں صرف رسمِ ختنہ اور قربانی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ اسلامی رجسٹری کے لفافے پر ابراہیمیؑ

مہریں سالم ہیں، لیکن اندر کے قیمتی نوٹ غائب ہو گئے۔ محض مکتوب الیہ
کی فریاد سے وہ نہیں ملیں گے۔ بھیجنے والے کو بھی ہیڈ پوسٹ آفس میں
درخواست دینی چاہیے۔"

حضرت یوسف علیہ السّلام کے دروازے کو یوں کھٹکھٹایا:-

یُوْسُفُ اَیُّھَا الصِّدِّیْقُ! دروازہ کیوں بند کیا ہے۔ صورت
دیکھنے دیجئے ___ مطمئن رہیے مصری عورتوں کی طرح چھری سے ہاتھ
نہیں کٹیں گے۔ جلوہ محمدیؐ نے جمال بینی کا عادی کر دیا ہے۔

میرے اچھے یوسف! تم سے کیونکر ہم کلام ہوں؟ جی چاہتا ہے
کہ بے باک ہو کر، گستاخ ہو کر، از خود رفتہ کیف ہیں، مجنونانہ جوش سے
خطاب کردں۔ مگر پیغمبری داب مانع ہے۔ ادبِ نبوت روکتا ہے۔
نہیں، نہیں اے عشاق کے مرکزِ تسلی! آج جو منہ میں آئیگا، کہوں گا۔
نہیں مانوں گا کہنے دو، ظاہری ضوابط کی پولیس کو ذرا پرے ہٹادو
جو ادب۔ ادب کی برابر صدا لگا رہی ہے۔

تم یوسف ہو، زلیخا کو ترسانے والے یعقوبؑ کو رلانے والے اتباؤ
تو کیا تم ہی مصری محبت کے دیوتا ہو؟ اس زمین پر کروڑوں ماہ لقا
دہرِ حقیقت کی تجلیوں سے آراستہ ہو کر آئے۔ پر تمھارے حسن کے
آگے سب ماند رہے۔ جب سنا یہی سنا کہ فلاں مثلِ یوسفؑ ہے۔

تمھاری ذات فلسفہ عشق کا نہایت باریک نکتہ ہے جو انسان کو قدرت
و فطرت کے اسرار کی جانب لے جاتا ہے اور بتاتا ہے کہ جنس بشر میں
مرد کی نوع محبوب بننے کے قابل ہے، تم جس زمانے میں تھے وہ عقل و
حکمت کا زمانہ تھا۔ آج کل کی سی کیفیت اُس زمانے کے عقلا کی نہ تھی

جو عورت کو درجہ محبوبیت کا مستحق گردانتے ہیں، محض اس لیئے کہ انھوں نے محبت کا منتہاء لورۂ نفسانی کی تکمیل کو خیال کر رکھا ہے۔

مشتاقوں کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والے یوسف! ہندستانی یوسف کا حال تم سے مخفی نہ ہوگا۔ اس کا نام کرشن تھا۔ متھرا اور گوکل کی روحوں میں پریم کی آگ بھڑکانے والا! ایسا فلسفی جس کے آگے سارے یورپ کے فلاسفر مات ہیں۔ اُس نے بھی اپنی ذات کو دنیا کے سامنے مجسم دلیل بنا کر پیش کیا تھا کہ اسرارِ عشق کا مخزن، مرد کی ذات ہے۔

میں شاہِ مصر، مقبول پروردگار پیغمبر، یعقوبؑ جیسے برگزیدہ نبی کے لخت جگر کو تم کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں، یہ گستاخی ہے لیکن شوقیہ معروضات میں اسے جائز بتایا گیا ہے۔

ہاں، ہاں۔ خواب کی تعبیر بتانے میں حضور کو بڑا ملکہ تھا۔ فرمایئے تو اس دنیا کے خواب کی تعبیر کیا ہے جہاں کے متحرک نظاروں نے میری نیند برباد کر دی ہے۔ اللہ سے کہیئے کہ مجھے میرا یوسف مل جائے۔

حضرت من! آپ کے مزارِ اقدس کا اور آپ کی روح مطہر کا وسیلہ لے کر رب العالمین سے صرف ایک چیز مانگتا ہوں کہ جو بہ اعتبار اسم ایک ہے وہ بہ اعتبار صفات میرا ہو جائے۔"

قصبہ خلیل الرحمٰن سے بیت اللحم گئے۔ یہاں حضرت مسیحؑ کی ولادت گاہ ہے قرآن شریف میں ہے فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ۔ کھجور کے نیچے مریم کے دردِ زہ شروع ہوا۔ وہ درخت تو اب باقی نہیں ہے، لیکن سنگ مرمر کے فرش میں ایک سوراخ اُس کی یادگار میں باقی رکھا گیا ہے۔

حضرت بابا فرید گنج شکر رح کے چلّے یا تکیئے کی بغل میں کوئی مدرسہ تھا۔ خواجہ صاحب اُسے بھی دیکھنے گئے۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں:-

اس مدرسہ کا بانی شیخ محمد الصالح آفندی عجیب قابلیت کا شخص ہے میں نے ہر درجے میں جاکر لڑکوں سے مسائلِ دین کے سوال کئے اُنھوں نے تڑتڑ جواب دیئے۔ چھوٹی سی عمر میں اُن کا سپاہیانہ طرزِ ادا حیرت ناک تھا۔ شیخ نے ایک خاص جگہ بٹھا کر اپنی تربیت کا تماشہ دکھایا۔ اوّل ایک جماعت آئی۔ اُس نے عربی زبان میں نعت کے گیت گائے۔ پھر سلطان ترکی محمد رشاد کی مدح کا ترانہ پڑھا۔ اس کے بعد رزمیہ قومی گیت گایا۔ کیا بیان کروں رزمیہ ترانے کا مجھ پر کیا اثر ہوا جسم کپکپانے لگا۔ اور میں بے خود ہو گیا۔ زندگی میں پہلا دن تھا کہ مسلمان بچوں کو وہ جنگی گیت گاتے سُنا تھا جسے میری روح روز گایا کرتی ہے۔

گیتوں کے ختم ہوتے ہی ایک پانچ برس کا بچہ پینترا بدل کر صف سے باہر نکلا اور اس نے یہ رجز پڑھا:-

(اردو ترجمہ) خون پیوں گا شیر ہوں۔ برچھی چلاؤں گا دلیر ہوں
میدانِ جنگ میری ماں کی گود ہے۔ جس میں مجھے بڑا چین آتا ہے

بچہ رجز پڑھ کر صف میں گیا تو دوسرا بچہ آگے بڑھا اور اُس نے پہلے بچے سے زیادہ جوش اور پُرانے تجربہ کار ایکٹروں کی طرح وہ کمال دکھایا کہ عقل چکرا گئی۔

میں نے ایک بچے سے پوچھا۔ دنیا پر کس کی حکومت ہے؟ تڑاق سے جواب دیا، عثمانیوں کی۔ اُستاد نے ٹوکا اور بتایا کہ فلاں ملک میں فلاں قوم حاکم ہے متانت سے اپنے سُرخ چہرے کو ملا کر کہنے لگا نعم یا سیدی نعم اعرف ہاں جناب میں جانتا ہوں۔ مگر غیر قومیں بادشاہ ہیں۔ حکومت ہر جگہ ترکوں ہی کی ہے۔ کیونکہ ہمارا ہلال سب کو نور پہنچاتا ہے اور آسمان پر ہمیشہ رہتا ہے صلیب

کو ہم نے کبھی آسمان پر نکلتے نہیں دیکھا۔

اس کے بعد دو بچوں میں مکالمہ ہوا۔ ایک نے دوسرے سے ایمان۔ عقاید۔ صوم۔ صلوٰۃ وغیرہ کے متعلق سوال، جواب کئے۔

الغرض کس، کس چیز کی تعریف کروں۔ سب کلیں درست ہے خدا جانے محمد الصالح یہاں کیوں پیدا ہوا؟ ہندستان میں جنم لیتا، تا کہ ہم اور وہ کچھ کام کرسکتے۔ شام کو محمد الصالح نے رچرڈ، شاہ انگلستان اور سلطان صلاح الدین کا جنگی ڈراما کیا۔ اس میں مدرسے کے لڑکے اور اُستاد دونوں شریک تھے۔

۱۲ر جولائی کو حضرت سلطان حسن ابن حضرت سلطان ادہم بلخی رحمۃ اللہ کے مزار پر گئے۔ وہاں سے حضرت داؤد علیہ السّلام کے مزار پر حاضر ہوئے۔

۱۳ر جولائی کو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے مزار کی زیارت کی۔

۱۴ر جولائی کا روزنامچہ یوں شروع ہوتا ہے:۔ علی الصباح لوگ اپنے اپنے کاموں کی طرف تفکرات میں غرق جا رہے تھے۔ میں نے بھی حرم قدس کا رُخ کیا اور سیدھا قبۃ الصخرا کے پاس پہنچا۔ لمبا چوڑا پتھر، شاندار اور خوبصورت قبہ میں قید ہے، اسے تخت رب العالمین کہتے ہیں۔ یہ کبھی وحی و تجلیات کا مہبط تھا اور عہد سلیمان سے لے کر اب تک بیت المقدس کی سب سے بڑی نشانی سمجھا جاتا ہے۔

اے رب العالمین کے مجازی تخت! مشہور ہے کہ تیرے پایہ کو پکڑ کر جو کچھ مانگا جائے وہ ملتا ہے۔ اس لئے میں بھی آج مانگتا ہوں اور ایسی شئے مانگتا ہوں جو آدم کی نسل میں کسی نے نہ مانگی ہوگی اور اس نامعلوم جوش سے مانگتا ہوں جو کسی عام انسان کو نہیں دیا گیا۔ جو کہوں زیبا ہے۔ کیونکہ اس وقت میری شان اعلیٰ ہے۔ سن۔ اگر تو سن سکتا ہے۔ نہیں تو اُس کو مخاطب کروں گا

جس کو تیرے واسطے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو سمیع و بصیر ہے۔ جو دانا و بینا ہے۔

لے دینے کی طاقت رکھنے والے! ذرا میری جرأت ہمت تو دیکھ بُلبلا سمندر سے بڑھنا چاہتا ہے، ذرہ آفتاب کو گہن لگاتا ہے۔ دھواں آگ پر غالب ہونے کی فکر کرتا ہے۔ تیری دی ہوئی دلیری سے۔ تیری بخشی ہوئی طاقت سے۔ اُس حقیقت لدنی سے جس کا اس وقت تیرے اور میرے سوا کوئی راز دار نہیں!

لکھا ہے اِنَّ اللہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے دیکھوں تو تجھ میں کتنی قدرت ہے۔ عبدیت کی چادر سے پاؤں نکالتا ہوں، اسرارِ وحدت کے حجرہ میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔

میری درخواست ہے کہ تار کے کھمبے اُکھاڑ دیئے جائیں۔ تار کاٹ ڈالا جائے اور میں آمنے سامنے ہو کر تجھ سے ہمکلام ہوں۔

تو نے موسیٰ کو کوہِ طور کے ایک درخت پر جلوہ دکھا کر بلایا تھا۔ میں اس حجرہ کے ستون سے لپٹ کر تجھے پکارتا ہوں۔

اے سمجھ میں نہ آنے والے وجود! یہ حجاب صبر شکن کب تک قائم رہیگا حجاب اُٹھا دے سامنے آجا اور دیکھ کر تو نے اپنے بندوں میں کیا سوز۔ کیا کیف اور کیا اثر پیدا کیا ہے۔ تیرے بے بس بندے تجھ سراپا اختیار کی محبت میں کیسے تڑپتے ہیں۔ فراق اُن پر کیسے ظلم توڑتا ہے۔ نیز معبود کا پردے میں رہنا بندوں کے تخیل کو کن کن اوہام میں مبتلا رکھتا ہے

شام کے نئے گورنر کی تقرری کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

نصرانی قصیدہ پڑھنے آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک مولوی صاحب نے اُسے دھکا دیا اور اُس کی جگہ خود کھڑے ہو گئے۔ مولوی صاحب کے بوسیدہ کپڑوں

اور پریشان حالی دیکھ کر گمان نہ تھا کہ یہ دو لفظ بھی بول سکیں گے۔ مگر واہ۔ لب کشائی کی دیر تھی بحرِ قلزم اُبل پڑا۔ مولانا نے کہا۔ اے متصرف! تو نے یہ کیا چمکدار کپڑے پہنے ہیں۔ انصاف کی چمک دکھا۔ تجھ سے پہلے بہت سے ظالموں نے ہمارے گلے دبائے۔ وہ بھی اسی شان و شوکت سے آئے تھے، تو بول! تیرے دروازے پر ظلمت کدہ لکھا جائے گا یا معدلت خانہ شخصی اور استبدادی حکومت کی دور میں ہم جکڑے ہوئے تھے مگر اب حریت و مساوات کا دور ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ خلفائے راشدین کے عہد کی مثل حکمرانی ہو۔ اس لئے میں تجھ سے کہتا ہوں کہ اپنے فرض کو پہچان ورنہ قوم تیرا اسار ابل نکال دے گی:

مولانا کے بعد نصرانی نے قصیدہ پڑھا۔ سامعین کے چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس قصیدے کو ویسا ہی خوشامدانہ سمجھ رہے ہیں، جیسا کہ ہندستان میں ہمارے قصائد کو سمجھا جاتا ہے۔

۷ر جولائی کو حضرت مریمؑ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ حضرت مریمؑ کے مزار کے پاس سے اوپر پہاڑ پر راستہ گیا ہے۔ جہاں بتایا گیا کہ حضرت سلمان فارسیؓ وغیرہ نامور اصحاب مدفون ہیں۔

شام کی امریکن سوسائٹی نے خواجہ صاحب کو ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ اور سوسائٹی کے صدر نے خواجہ صاحب کے متعلق تقریر کی تھی۔ اس کا خواجہ صاحب نے یہ جواب دیا:۔

(اردو ترجمہ) میز کی اس چھری کی قسم، جس سے میں نے محبت کے گوشت کو ابھی ابھی کاٹ کر کھایا ہے، ہم سب ایک ٹھنڈے وقت میں یکجا ہوئے ہیں۔ تاریخ کے جن صفحات کا (صدر کی تقریر میں) ذکر آیا ہے وہ زمانہ ہوتا تو اسی قسم کی چھری دشمنی سے گوشت کاٹتی۔ ہم سب نے اپنے حالات کو بدل لیا، مگر چھری نے

نے اپنی کاٹ نہیں بدلی۔ وہ گوشت پوست پر برابر چل رہی ہے۔

ان ہی مقدس پہاڑوں میں ہمارے اور آپ کے بزرگوں نے بہشت کی خاطر خون بہائے تھے اور مجھے یقین ہے وہ بہشت میں گئے ہوں گے لیکن خدا نے ہمیں بھی آج جو صحبت عنایت کی ہے اسے بہشت سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ فارسی کا شعر ہے

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد
کسے را با کسے کارے نہ باشد

بس یہی حالت آپ لوگوں کی ہے۔ لہذا میں آج کی رات کو بہشتی رات کہتا ہوں۔ گو یہاں بوڑھے زیادہ نظر آ رہے ہیں۔ اور ہم مسلمانوں کے نزدیک بہشت میں سب نوجوان ہوں گے۔ تاہم جب میں بہ اعتبار سیرت نظر کرتا ہوں تو حاضرین میں کسی کو بوڑھا نہیں پاتا اور بہشتی رات کی تشبیہہ موزوں ہو جاتی ہے۔

۲۲ر جولائی کو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ کے تکئے اور چلے گاہ کی زیارت کی۔
آج کی رات معراج کی رات ہے اور خواجہ صاحب وہاں ہیں جہاں سے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔ معراج کا بیان جگہ جگہ ہو رہا ہے۔ مسجد اقصیٰ میں خطیب شہر نے تقریر کی اور قبۃ الصخرا میں مفتی شہر نے۔ خواجہ صاحب مفتی صاحب کی تقریر میں شریک تھے۔ اُن کی تقریر کے بعد خواجہ صاحب نے گورنر شام سے خواہش کی کہ اس منبر پر ایک ہندستانی کو بھی کچھ کہنے کی اجازت دیجئے تاکہ ہندستانی فخر کر سکیں کہ اُن کی اردو زبان میں قبۃ المعراج کے اندر ذکر رسول ہوا۔ گورنر نے اجازت دے دی۔ خواجہ صاحب منشی عبداللطیف رتلامی کو تیار کر کے لے گئے تھے۔ منشی صاحب کا لحن اول تو یوں ہی پر اثر تھا پھر یہ خاص موقع، چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

۲۳ر جولائی حریم قدس سے روانگی کا دن تھا۔ خواجہ صاحب نے کہا:-

الوداع اے پاک و بابرکت زمین! جو آیا تھا، وہ جاتا ہے، تو بھی عدم سے آئی ہے۔ چل۔ آنے والے کے لئے جانا لازمی ہے۔ کب تک ان پہاڑوں کی گود میں سوئے گی؟

قدرت والے۔ کرم و فضل والے خدا۔ تیرا یہ عاجز بندہ مقام مقدس سے رخصت ہوتا ہے۔ شاید یہ شاداب و دل آویز نظارہ میرے جسم کی آنکھوں کو پھر میسر نہ آئے۔ تیرے گھر کی خیر۔ میرے گھر کی خیر۔ تیرے بندوں کی خیر۔ میرے دوستوں، بزرگوں اور پیاروں کی خیر۔ جسے تو چاہتا ہے اُس کی خیر۔ جسے میں چاہتا ہوں اُس کی خیر۔

رملہ۔ یافہ۔ حیفہ اور بیروت کی جھانکی مارتے ہوئے دمشق پہنچے، بیروت سے دمشق تک کے پہاڑوں کے متعلق خواجہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"ان کی دل فریبی کا کیا کہنا۔ جب ریل اونچی چوٹی پر چڑھتی ہے تو غاروں اور وادیوں کی سرسبزی۔ انگوروں کی بیلوں کا لہلہانا۔ بادلوں کا نیچے گھرا ہوا نظر آنا۔ سامنے کوسوں سمندر کی سطح، ایسے نظارے ہیں کہ جی سیر نہیں ہوتا۔ یہی وہ شامی پہاڑ ہیں جن کے تذکرے توریت۔ انجیل اور قرآن میں جگہ جگہ ہیں۔ ہندستان کے ہریالے پہاڑ بھی میں نے دیکھے ہیں۔ سبحان اللہ اپنی شان میں نمونۂ قدرت ہیں، لیکن شامی پہاڑوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مخفی حسن کا جلوہ بکھیر دیا ہے درخت اور پتے تو درکنار جنگلی کانٹوں تک کی رنگینیاں اور شوخیاں آنکھوں میں کھپی جاتی ہیں۔

سمجھاؤں اس واحدی کو۔ مجھے بلاتا ہے۔ زیادہ ٹھیرنے سے روکتا ہے اور اپنی کیفیتِ انتظار دکھانے کے لئے انشا پردازی کرتا ہے۔"

دمشق میں حضرت بلال رضؓ اور حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ کے مزارات پر حاضری دی۔ دونوں برابر آرام کر رہے ہیں اور اسلامی مساوات کا ثبوت دے رہے ہیں۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں :۔

جوں ہی مرقدِ بلال پر نگاہ پڑی آنسو سامنے آگئے اور پلکوں کو ہلانے لگے کھاری پانی کی چادریں رُخ چشم کے آگے تنتی تھیں اور گِر پڑتی تھیں۔ بے ادب ہاتھوں نے اپنے باپ کے محبوب بلالؓ کا قبر پوش تھام لیا۔ اس میں ایک بجلی تھی۔ ہاتھ کانپتے تھے، زبان لرزتی تھی۔ فاتحہ کے بدلے والضحیٰ مُنہ سے نکلنے لگی۔

اُٹھو بلال، اٹھو۔ باباجان تم سے چلو۔ جاگو بلال، جاگو۔ اذان کا وقت ہو گیا۔ میں تمہاری چادر کھینچ لوں گا۔ میں تمہارے پاؤں میں گدگدیاں کروں گا۔ سونے نہیں دوں گا۔ آنکھیں کھولو، تمہارے آقا کا نواسہ تم کو جگا رہا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑو اور اُس گھر تک پہنچا دو۔ جہاں صبح صبح، نور کے تڑکے آواز دیا کرتے تھے، اَلصَّلوٰۃ اَلصَّلوٰۃ یا رسول اللہ۔

تم نے وہ ہونٹ ہلتے دیکھے ہیں جن سے یا بلالؓ کی صدا نکلتی تھی جو تمھیں اذان اور اجتماع مومنین کا حکم دیتے تھے۔ تم نے وہ آنکھیں دیکھی ہیں جو تمہارے چہرے پر محبت کی نظریں ڈالا کرتی تھیں۔

بلال، بلال۔ بلال! تم نے "کسی" کی موجودگی میں اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدً الرَّسُوْلُ اللہ کہا ہے۔ تم نے اِس کے مزے لوٹے ہیں کہ جس کی رسالت کی گواہی دیتے ہو وہ تمہارے پاس موجود ہے۔ اب یوں چپ چاپ چھپے ہوئے لیٹے ہو۔ نہیں، نہیں اُٹھو اور میرا ہاتھ پکڑو۔

میرے آقا بلال۔ میرے مولیٰ بلال۔ میرے سیّد بلال! قدم دو، اُنھیں چوموں۔ جوتیوں کی خاک دو، سر پر رکھوں، آنکھوں میں ڈالوں"۔

یہیں امیر معاویہ کا مزار بھی ہے اور یہیں اہلِ بیت میں حضرت زینبؓ اور حضرت فاطمہ صغریٰؒ وغیرہ کے مزارات کی بھی زیارت نصیب ہوئی۔

اسی قبرستان کے قریب حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ کی وہ مسجد ہے جو انھوں نے فتح دمشق کی یادگار میں بنائی تھی۔

یزید کی قبر بھی دیکھی۔ قبر کا نشان باقی نہیں رہا ہے، خلقت ہر وقت اُس پر پتھر پھینکتی رہتی ہے۔

۳۰ رجولائی کو حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے مزار کی زیارت کی حضرت ابن عربی کے مزار کے پائیں شہرہ آفاق بہادر امیر عبدالقادر جزائری کا مرقد مطہر ہے جس نے فرانس کو تونس اور الجزائر میں لوہے کے چنے چبوا دیے تھے۔

یکم اگست کو دمشق سے حجاز ریلوے میں مدینہ منورہ روانگی ہوئی خواجہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"گاڑی چلی تو شوقِ مدینہ نے مسافروں کو بے قرار کر دیا۔ راستے میں مدائن صالح اسٹیشن آیا۔ قرآن مجید میں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہے۔ اس کے آثار پہاڑوں میں اب تک موجود ہیں۔ ریل میں سے پہاڑوں کے اندر مکانوں کے دروازے معلوم ہوتے ہیں۔ اور مقام تبوک آیا، جہاں کا غزوہ مشہور ہے۔

چھٹے دن فجر کی نماز کے بعد سے مسافروں میں خوشیاں ہیں کہ وہ قریب ہے جس کے لیے سفر کیا ہے۔ ذرا دن چڑھا تو کالے پہاڑوں کے بیچ میں سبز گنبد کی یوں ہی سی جھلک دکھائی دی، جیسے اندھیری رات میں کہیں دور آسمان کے کنارے بجلی کوندا کر دیتی ہے۔ اس سبزی کی جھلک نے جو کہرام گاڑی میں مچایا وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ کلیجے پھٹے جاتے تھے، ہاتھ گریبانوں پر تھے، دل

تھامتے تھے۔ کرتے چاک کرتے تھے۔ گردنیں کھڑکیوں سے باہر تھیں۔ آنکھیں ٹکٹکیاں باندھ رہی تھیں۔ ریل لہراتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔

لے لو۔ وہ سامنے، اب خوب صاف اچھی طرح نظر آتا ہے، ہاں سبز گنبد ہے۔ اونچے مینار ہیں۔

مدینہ آیا۔ مدینہ آیا۔ ذرا میں بھی دیکھوں کہاں ہے کچھ سنا آسمان والے نغمہ سرائی کر رہے ہیں۔

انجن کو روکو۔ پہلے وہ کیوں جائے۔ مادی روح۔ مادی جسم کا پتلا ہمیں بڑھنے دو، اشرف المخلوقات ہیں۔ اشرف الانبیا کی اشرف اُمت ہیں بصارت و بصیرت رکھتے ہیں۔ لو وہ رُک گیا۔

دیکھنا۔ کیسی سہانی، لمبی، لمبی قباؤں والے، نورانی چہرے استقبال کرنے آئے ہیں۔ آنکھیں سامنے سے ہٹیں تو میں بھی پہچانوں۔ کہتے ہیں اترو۔ پہلے کونسا قدم اُتاروں؟ سر کے بل کیسے چلتے ہیں۔ میں بھی ویسے ہی چلوں۔

دل دھڑک رہا ہے۔ اِسے سنبھالوں۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہے۔ جسم کی توانائی نے جواب دے دیا۔ کیا کروں؟۔ لوگو میرا ہاتھ پکڑنا۔ میں چلا۔ سہارا دینا میں گرا۔

پلیٹ فارم کے سنگریزوں نے پاؤں سے مصافحہ کیا اور حسن عبدالجواد آفندی مزور نے ہاتھوں سے۔

باب رحمت کے سامنے مکان مل گیا اور حاضری دربار کی تیاریاں ہونے لگیں۔

بے تابانہ اُن سبز جالیوں کی طرف بڑھا جو مسجد میں بائیں طرف کو ہیں، اندر خبر نہیں کیا ہے۔

بجلی معمولی تانبے کے تار میں رہتی ہے۔ تلوار کی کاٹنے والی دھار لوہے کی ہوتی ہے۔ ابر رحمت کی بوند چھوٹی سی مگر شیریں اور سیراب کنندہ۔ یہی حال اُس حجرے کا ہے۔ دیکھنے میں ایک جگہ حقیقت اللہ کے بعد ہر چیز سے اعلیٰ اور بزرگ

جھانک رہا تھا اور دل سے باتیں کر رہا تھا۔ یکایک کلیجے میں ہوک اُٹھی۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ کسی نے سر کو جالی سے لگا دیا۔ آنکھوں نے مینہ برسانا شروع کیا۔ ہونٹ اس ٹھنڈی جالی کو چومتے تھے۔ انگلیاں گڑی جاتی تھیں۔

ادب، اے گستاخ تخیل۔ ادب، اے ناپاک غور۔ یہ مکان فلسفیانہ سوچ بچار کا نہیں ہے۔ یہاں بادشاہ اپنا پالٹیکس بھول جاتے ہیں عقلا عقل سے دست بردار ہو کر آتے ہیں۔ یہ محبوب خدا کی خوابگاہ ہے۔ یہ وہ خوش نصیب خطہ ہے جس کی قسمت پر آسمان۔ زمین۔ عرش۔ کرسی سب رشک کرتے ہیں۔

بابا جان! مجھے اپنا بنا لو اور اُس کو بھی جسے میں اپنا بنانا چاہتا ہوں اور جو میرا بننا چاہتا ہے۔ اور کیا کہوں، تمام باتیں بھول گیا۔ نہ جانے کیا کیا کہنا تھا۔

السّلام علیکم یا سیّد الکونین۔ السّلام علیکم یا وسیلتنا فی الدارین! خوش بخت ہیں یہ آنکھیں، جو آپ کے روضۂ اطہر کی زیارت کر رہی ہیں۔ تقدیر والا ہے یہ ہاتھ جو روضے کی نورانی جالی کو تھامے ہوئے ہے اور زبان کی عزت پر تو جتنا ناز کیا جائے کم ہے کہ وہ اس زندہ اور زندہ کرنے والے نبی سے کلام کر رہی ہے۔۔

یا رسول اللہ! آپ کا ناکارہ، ناخلف حسن نظامی حالِ دل عرض کرنا چاہتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ حی و قیوم کی عنایت سے حضور جامۂ حیات میں

موجود ہیں۔ دیکھ سکتے ہیں اور وہ کر سکتے ہیں جو دوسرا نہیں کر سکتا۔

اسلام۔ آپ کا پیارا اسلام۔ آپ کے خدا کا مقبول اسلام۔ آپ کے جدِ امجد سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام کا پسندیدہ اسلام نرغے میں ہے۔ اعدا نے گھیر لیا۔ اکیلا رہ گیا۔ اُس کا کوئی یار و ناصر، نظر نہیں آتا۔

عرب دریائے اسلام کا سرچشمہ دن بدن پست ہو رہا ہے۔ دشمن اُسے زیرِ نگیں کرنے کی فکر میں ہیں۔ اُس عرب کو زیرِ نگیں کرنا چاہتے ہیں جس نے ساری دنیا کو زیرِ نگیں کر لیا تھا۔

عرب کی محافظ سیفِ عثمانی کو بھی زنگ لگ گیا۔ صاحب السّیف نے حرّیت کی صیقل سے اُسے صاف کرنا چاہا تھا۔ مگر صیقل میں اجانب کے تیزابی عناصر کی آمیزش سے اندیشہ ہے کہ وہ اس تیز اور دھار دار تلوار کی کاٹ بیکار کر دیں گے۔

میں پاک مدینے میں غیروں کے سکّے چلتے دیکھتا ہوں اور غیروں کی تجارت کا فروغ پاتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں

حضور! ایک بیرونی مملکت کا نقرئی سکّہ یہاں پورے دام میں چلتا ہے اور طلائی کے دام اصل سے بھی زیادہ ہیں۔ اس کے برعکس ترکی جس کی حکومت ہے اُس کے سکّے پر بٹّہ لگتا ہے۔

سرکار! سکّہ حکمرانی کی نشانی ہے۔ تو کیا غیروں نے مدینے کی حکمرانی میں دخل نہیں حاصل کر لیا ؟

غیر ممالک کے کپڑے کی ایسی افراط ہے کہ مُردے اسی کا کفن پہن کر بقیع جیسے قبرستان میں دفن ہوتے ہیں۔ آپ کی اُمّت کفن کے لئے بھی غیروں کی محتاج ہے۔

بجلی معمولی تانبے کے تار میں رہتی ہے۔ تلوار کی کاٹنے والی دھار لوہے کی ہوتی ہے۔ ابرِ رحمت کی بوند چھوٹی سی مگر شیریں اور سیراب کنندہ۔ یہی حال اس حجرے کا ہے۔ دیکھنے میں ایک جگہ حقیقت اللہ کے بعد ہر چیز سے اعلیٰ اور بزرگ

جھانک رہا تھا اور دل سے باتیں کر رہا تھا۔ یکایک کلیجے میں ہوک اٹھی۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ کسی نے سر کو جالی سے لگا دیا۔ آنکھوں نے مینہ برسانا شروع کیا۔ ہونٹ اس ٹھنڈی جالی کو چومتے تھے۔ انگلیاں گڑی جاتی تھیں۔

ادب، اے گستاخ تخیل۔ ادب، اے ناپاک غرور۔ یہ مکان فلسفیانہ سوچ بچار کا نہیں ہے۔ یہاں بادشاہ اپنا پالٹیکس بھول جاتے ہیں عقلا عقل سے دست بردار ہو کر آتے ہیں۔ یہ محبوب خدا کی خوابگاہ ہے۔ یہ وہ خوش نصیب خطہ ہے جس کی قسمت پر آسمان۔ زمین۔ عرش۔ کرسی سب رشک کرتے ہیں۔

بابا جان! مجھے اپنا بنالو اور اس کو بھی جسے میں اپنا بنانا چاہتا ہوں اور جو میرا بننا چاہتا ہے۔ اور کیا کہوں، تمام باتیں بھول گیا۔ نہ جانے کیا کیا کہنا تھا۔

السلام علیکم یا سید الکونین۔ السلام علیکم یا وسیلتنا فی الدارین! خوش بخت ہیں یہ آنکھیں، جو آپ کے روضۂ اطہر کی زیارت کر رہی ہیں۔ تقدیر والا ہے یہ ہاتھ جو روضے کی نورانی جالی کو تھامے ہوئے ہے اور زبان کی عزت پر تو جتنا ناز کیا جائے کم ہے کہ وہ اس زندہ اور زندہ کرنے والے نبی سے کلام کر رہی ہے۔

یا رسول اللہ! آپ کا ناکارہ، ناخلف حسن نظامی حالِ دل عرض کرنا چاہتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ حی و قیوم کی عنایت سے حضور جامۂ حیات میں

موجود ہیں۔ دیکھ سکتے ہیں اور وہ کر سکتے ہیں جو دوسرا نہیں کر سکتا۔

اسلام۔ آپ کا پیارا اسلام۔ آپ کے خدا کا مقبول اسلام۔ آپ کے جدِ امجد سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام کا پسندیدہ اسلام نرغے میں ہے۔ اعدا نے گھیر لیا۔ اکیلا رہ گیا۔ اُس کا کوئی یار و ناصر، نظر نہیں آتا۔

عرب دریائے اسلام کا سرچشمہ دن بدن پست ہو رہا ہے۔ دشمن اُسے زیرِ نگیں کرنے کی فکر میں ہیں۔ اُس عرب کو زیرِ نگیں کرنا چاہتے ہیں جس نے ساری دنیا کو زیرِ نگیں کر لیا تھا۔

عرب کی محافظ سیفِ عثمانی کو بھی زنگ لگ گیا۔ صاحب السّیف نے حریت کی صیقل سے اُسے صاف کرنا چاہا تھا۔ مگر صیقل میں اجانب کے تیزابی عناصر کی آمیزش سے اندیشہ ہے کہ وہ اس تیز اور دھار دار تلوار کی کاٹ بیکار کر دیں گے۔

میں پاک مدینے میں غیروں کے سکّے چلتے دیکھتا ہوں اور غیروں کی تجارت کا فروغ پاتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں

حضور! ایک بیرونی مملکت کا نقرئی سکّہ یہاں پورے دام میں چلتا ہے اور طلائی کے دام اصل سے بھی زیادہ ہیں۔ اس کے برعکس ترکی جس کی حکومت ہے اُس کے سکّے پر بٹّہ لگتا ہے۔

سرکار! سکّہ حکمرانی کی نشانی ہے۔ تو کیا غیروں نے مدینے کی حکمرانی میں دخل نہیں حاصل کر لیا؟

غیر ممالک کے کپڑے کی ایسی افراط ہے کہ مُردے اسی کا کفن پہن کر بقیع جیسے قبرستان میں دفن ہوتے ہیں۔ آپ کی اُمّت کفن کے لئے بھی غیروں کی محتاج ہے۔

حکومت ہمارے ہاتھوں سے نکلی چلی جا رہی ہے۔ چین میں ہم محکوم! جاوا میں ہم محکوم۔ تاتار و بخارا میں ہم محکوم۔ ہندستان میں ہم محکوم۔

ایران کی کشتی ڈگمگا رہی ہے۔ مراکو کا گلا کٹ چکا ہے۔ خون بہہ رہا ہے وہ بھی تھم جائے گا۔

مصر کو ابھی دیکھ کر آیا ہوں۔ مسلمان سربازار شراب پیتے ہیں اور دین کی کسی بات میں جی نہیں لگاتے۔

افغانستان دو الجھنوں کے بیچ میں ہے۔ اِدھر بھی ٹکر اُدھر بھی ٹکر! ہر، پھر کر نگاہیں آپ کے پُراسرار دروازے کی طرف اٹھتی ہیں، اور ہم سب انکشافِ غیب پر اپنی ہستی کا قرار تصور کئے ہوئے ہیں۔

یا رسول اللہ! کاسہ لبریز ہو گیا۔ جلد ظہور فرمائیے اور بے کس و بے بس اُمت کی دست گیری کیجیے۔

حضرت مسیحؑ کی امت صرف حکومت ہی کی مالک نہیں ہے۔ تمدن، شائستگی اور حسنِ اخلاق بھی اُس نے ہم سے چھین لیا ہے۔ اِن ممالک میں مسلمان اور نصاریٰ پہلو بہ پہلو آباد ہیں۔ حکمرانی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، مگر خوش حالی کا اثر مسلمانوں میں نہیں پایا جاتا۔ صورتیں بھی نصاریٰ کی بشاش، لباس بھی نصاریٰ کے نفیس۔ گھر بھی نصاریٰ کے آراستہ۔ اخلاق بھی نصاریٰ کے اچھے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ کام سے جی نہیں چراتے۔ مجمل شناسی میں اُن کا پلہ ہم سے بہت بھاری ہے۔

مصر۔ بیت المقدس۔ بیروت۔ دمشق وغیرہ مقامات میں، آپ کے غلام نے مسلمان اور عیسائی زندگی کو خوب غور کر کے دیکھا، زمین آسمان کا فرق ہے۔

عیسائی طعنہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب اسلام اس زبونی کا ذمہ دار ہے۔ حالانکہ اسلام کا قصور ہوتا تو ابتدا میں، اور مدتوں قوم مسیحی سے مسلمان کیونکر برتر رہتے۔ دنیا جانتی ہے کہ ہم ہی نے دنیا کو شائستگی و تمدن کی تعلیم دی تھی۔ ہم نصاریٰ کی موجودہ خوبیوں سے زیادہ خوبیاں رکھتے تھے۔

جہاں پناہ! اس عالم افسردگی کے عرض حال کے بعد دو جملے خوشی کے بھی سماعت فرمائیے۔ ہم مرے نہیں ہیں، ہماری تعداد دنیا میں ریل کی سڑک کی طرح پھیل رہی ہے۔

دوسرا ثبوت ہماری حیات کا یہ ہے کہ حضور کے نام نامی پر ہم سب فدا ہیں۔ ہمارے دل آپ کی محبت میں یکساں شریک و گرفتار ہیں۔ اس مرکز یزدانی کے دائرے سے کسی کا قدم باہر نہیں نکلا ہے۔

میرا وطن ہندستان جاگا ہے۔ اٹھنا چاہتا ہے۔ بلکہ اٹھ رہا ہے۔ ہمارے تمام افراد میں حرکت پیدا ہو گئی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا ستارہ افق امید پر طلوع ہو گیا ہے۔ ہم اسے چاند بنائیں گے اور اس کی روشنی میں آگے بڑھیں گے۔ ٹھنڈی روشنی میں حرارت پیدا کریں گے۔

دیکھئے ترقی کی یہ شاہ راہ ہمیں صاف کر کے دی جاتی ہے یا توڑ پھوڑ کر۔

اے سرور دو جہاں! دلی کے برباد شہزادوں کا نالہ و بکا بھی پیش کرتا ہوں۔ وہ تاج و تخت کو نہیں روتے۔ انھیں روکھی روٹی کا ٹکڑا اور تن ڈھکنے کو موٹا جھوٹا کپڑا درکار ہے۔ ان کی ذلت و رسوائی کی حد ہو چکی۔ بد اعمالیوں کا کافی بدلہ مل چکا۔ اب خطا پوش پروردگار سے انھیں معافی دلوا دیجئے۔

امت کے یتیموں پر بھی ایک نظر لطف۔ ان کا مفلسی کے وقت کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ در بدر بھٹکتے پھرتے ہیں اور دشمنان اسلام کی کمند

کفنیں باندھے جاتے ہیں۔

اُن لاوارث بیواؤں کی جانب بھی اشارۂ نوازش جو گھر کے سرتاج کو روتی ہیں اور آپ کی پناہ میں آتی ہیں۔

اُمت کے بیماروں کی طرف سے طبیب الکل کی کنڈی کھٹکھٹا رہا ہوں جسم و روح کی شفا و تندرستی مانگتا ہوں۔ افلاس زدہ ملک کے بے چارہ بے کار افراد کے لئے فارغ البالی اور تونگری طلب کرتا ہوں غنی و وہاب خدا سے کہیے کر دے، گناہگاروں کی شرمساری اور ندامت خدمت میں لایا ہوں اُنھیں توفیقِ نیکوکاری ملنے کی دعا کیجئے۔

سوختہ دل عشاق دل کا قرار چاہتے ہیں۔ بیلئے صفت محبوب اُن محبوں سے رستگاری کے خواستدگار ہیں جو فرضی قیس بن کر مجنونانہ حرکات کرتے ہیں اور امن و وقار و عزت کو بدنامی کا داغ لگاتے ہیں۔

میں خود سکوت کا طالب ہوں، محویتِ کامل کا متمنی ہوں۔ راحتِ دل آبِ چشم اور وقتِ خوش مانگتا ہوں۔ گوشۂ عافیت دلوا دیجئے، حجرہ فنا در بقا و بقا در فنا تک پہنچا دیجئے، تاکہ یہ جالیاں۔ یہ درمیانی حجابات سدِّ راہ نہ ہوں اور منزلِ ابد قرار ہاتھ آ جائے۔"

یہ ہیں خواجہ حسن نظامی اور یہ ہے اُن کی زندگی کے کارناموں میں کی ایک کارنامہ۔ اِن اقتباسات سے خواجہ صاحب کی اُفتادِ طبع اور خواجہ صاحب کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے اور خواجہ صاحب کے زورِ خطابت کا پتہ لگتا ہے۔ خواجہ صاحب تقریروں میں بھی یہی طرزِ خطاب اختیار کیا کرتے تھے یہ مصنوعی چیز نہیں تھی، خداداد چیز تھی۔ اُردو زبان کو وہ بہت سی چیزیں دے گئے ہیں جو اُن سے پہلے اُردو کے پاس نہیں تھیں اور جن اُن کے بعد بھی تقلید

مشکل ہے۔ مثلاً چلیے، چٹکیاں، گدگدیاں۔ دعائیں اور یہ خطاب۔

مدینہ منورہ میں خواجہ صاحب نے پندرہ روز قیام کیا۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزار پر حاضر ہوئے۔ سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہرہ رضؓ اور دیگر ائمہ اطہار کے مزاروں کی زیارت کی۔ میدانِ اُحد میں جا کر حضرت امیر حمزہ رضؓ کے مزار پر حاضری دی۔ مسجدِ قُبا دیکھی۔

خواجہ صاحب کی آدھی سے زیادہ زندگی سفر میں گزری تھی۔ وہ سال میں سات مہینے سفر کرتے تھے، لیکن ۱۹۱۱ء کا سفرِ مصر و شام و حجاز صرف ۱۹۱۱ء کا نہیں، خواجہ صاحب کی پوری زندگی کا اہم ترین سفر ہے۔ یہ سارا سفر خواجہ صاحب نے پیسے کی قلت کے باوجود شان سے کیا، اتنی شان سے کہ بمبئی پہنچے تو پیسہ پیسہ خرچ کر چکے تھے اور مزدوروں کو مزدوری دینے کے لئے اور دلی کا ٹکٹ لینے کے لئے سید علی وجدیؔ[1] کا قرضدار بننا پڑا۔

مالی عروج کی ابتدا

لیکن میں سوچ رہا ہوں اور یاد کر رہا ہوں کہ خواجہ صاحب کا مالی عروج اس سفر کے اختتام سے شروع ہوا تھا یا خواجہ بانو کے عقد سے یہ دوسرا عقد خواجہ صاحب نے ۱۹۱۶ء میں کیا تھا، اخبار توحید میرٹھ کی ایڈیٹری سے فراغت پا کر۔ اخبار توحید کا ذکر اُس کے محل پر کروں گا۔

---

[1] وجدی صاحب درگاہ حضرت سلطان المشائخ کے متوسلین میں سے تھے لیکن خدا معلوم کیوں بمبئی جا بسے تھے۔ نوجوانی میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ میں نے اُنھیں نہیں دیکھا۔

میرا خیال ہے مالی عروج میں دونوں کی برکت شامل تھی۔ اس سفر نے بھی خواجہ صاحب کو بہت چمکا دیا تھا اور خلقت کی رجوعات بے انتہا بڑھا دی تھی۔ اور بیوی کا بیرا تو مشہور ہی ہے۔ روپیہ بیوی کی قسمت سے آتا ہے۔

سفرنامہ ابھی نظام المشائخ ہی چھاپ رہا تھا۔ سفر کے سلسلے کی پہلی کتاب خواجہ صاحب نے "شیخ سنوسی" کے نام سے ۱۹۱۲ء میں اُس مہینے شائع کی جس مہینے لارڈ ریڈنگ، وائسرائے ہند پر بم پھینکا گیا ہے "شیخ سنوسی" چھوٹی سی کتاب تھی۔ اسی کے ساتھ میں نے جامہ سپ نامہ کا ترجمہ کر کے شائع کیا۔ دونوں کتابیں چار چار آنے قیمت کی تھیں۔

اُن دنوں وی۔ پی کی رجسٹری کا جھگڑا نہیں تھا۔ صرف ایک ایک آنہ محصول لگا کر دونوں کتابوں کے وی۔ پی جاتے تھے۔ دونوں میں پیشین گوئیاں تھیں دونوں خوب مقبول ہوئیں۔

لارڈ ہارڈنگ کا جلوس نکلا تو جلوس دیکھنے میں اور خواجہ صاحب بھی گئے دریبے اور خونی دروازے سے ذرا آگے، کوتوالی اور فوارے سے ورے بیچ کی پٹری[1] پر کھڑے تھے۔ جلوس شاہانہ شکوہ کے ساتھ لال قلعہ کی سمت چل رہا تھا۔ چلتے چلتے رک گیا۔ اور غالباً دس منٹ کے بعد دوبارہ چلنے لگا۔ جلوس کے رکنے کی کی وجہ نہ ہماری سمجھ میں آئی اور نہ اور کسی کی۔ جتنے منہ اُتنی باتیں۔ ہمارے ارد گرد سینکڑوں آدمی تھے۔ لیکن حقیقی وجہ سے سب بے خبر تھے۔ مگر ہم دو کے سوا سب اظہار رائے کر رہے تھے۔

---

[1] چاندنی چوک کے بیچ کی نہر میں نے دیکھی ہے۔ نہر کو بند کر کے پٹری سے بدل دیا گیا تھا۔ پھر پٹری بیچ سے دونوں طرف کی دوکانوں کے سامنے چلی گئی تھی۔

شام تک افواہیں پھیلائیں۔ اُن میں بم پھینکنے کی افواہ بھی تھی۔ آخر اخبارات نے اس افواہ کی تصدیق کر دی۔ ہمارے ہاں شیخ سنوسی اور حجاماب نامہ کے خریداروں کا تانتا لگ گیا۔ خریداروں میں عوام بھی تھے اور سی۔ آئی۔ ڈی والے بھی۔

دوسرے دن عبداللہ خاں، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، سی۔ آئی۔ ڈی نے خواجہ صاحب کو طلب کیا اور انھیں لے کر اُس چھت پر گئے جس پر سے بم گرا تھا۔ وہاں کئی انگریز خواجہ صاحب کے منتظر تھے۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے لئے ہمیں کو توالی اور تھانے کے ایک رُخ کی بجائے دوسرے رُخ پہنچا دینا اور چھت پر چڑھا دینا کیا دشوار تھا۔ مگر سی۔ آئی۔ ڈی کے ان مسلمان افسر نے خواجہ صاحب کے بچاؤ کی گفتگو کی۔ انگریز ممالک اسلامیہ کے سفر اور "شیخ سنوسی" کتاب کی وجہ سے بدگمان تھے اور خواجہ صاحب سے اُلٹے سیدھے سوال کر رہے تھے، عبداللہ خاں نے یہ کہہ کر خواجہ صاحب بدنیت نہیں ہیں، بے احتیاط ہیں، جو جی چاہا لکھ ڈالتے ہیں، خواجہ صاحب کا پیچھا چھڑایا۔ اُن انگریزوں کے وہم کی رگ بار بار پھڑکتی تھی اور خواجہ صاحب بار بار بلائے جاتے تھے اور عبداللہ خاں ہمیشہ پیچھا چھڑا دیتے تھے۔

عبداللہ خاں اُس زمانہ میں جامع مسجد کے پیچھے رہتے تھے۔ پھر اُنھوں نے بالکل میرے برابر مکان لے لیا اور مجھ سے اُن کے خاصے مراسم ہو گئے۔ ایک دن کہنے لگے کہ ہارڈنگ بم کیس میں جیسی غلطی کی ہے ویسی غلطی پچیس برس کی نوکری میں کبھی نہیں کی۔ اصل مجرم پانڈی چری میں زندہ سلامت بیٹھا ہے اور ماسٹر امیر چند غریب خواہ مخواہ پھانسی چڑھا دیے گئے۔ لارڈ ہارڈنگ کا معاملہ تھا۔ ایک نہ ایک کے گلے میں پھندا پڑنا ضروری تھا۔ میں نے کہا، یہ

پھندا خواجہ صاحب کے گلے میں بھی پڑ سکتا تھا؟ بولے۔ ہاں۔ ایک نہ ایک کے گلے میں پڑنا ضروری تھا۔

خواجہ صاحب کی زندگی میں دو موقعے ایسے آئے ہیں کہ اُن پر قتل کی سازش کا شبہہ کیا گیا۔ ایک تو یہی لارڈ ہارڈنگ والا موقع تھا۔ دوسرا، سوامی شردھانند والا۔ سوامی جی کی داستان بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ خواجہ صاحب کے پژمردہ جسم کے اندر اعصاب فولادی تھے دونوں موقعوں پر میں پریشان ہوا۔ لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکنے کے وقت میری شادی میں پانچ، چھ دن باقی تھے۔ میں شادی کی شادمانی بھول گیا۔ اور سوامی شردھانند کے واقعے کے وقت مجھے مقوّی اعصاب گولیاں کھانی پڑیں لیکن خواجہ صاحب دونوں موقعوں پر کامل اطمینان سے اپنے کاموں میں مصروف رہے۔ میں نے جلوسوں اور جلسوں میں شرکت کرنے سے توبہ کر لی اور خواجہ صاحب کے اپنے جلوس نکلنے لگے اور خواجہ صاحب کے اپنے جلسے ہونے لگے۔ اور خواجہ صاحب کے اپنے اوپر پستول کی گولیاں برسنے لگیں۔ سنہ ۱۹۱۲ء کا اس سے زیادہ قابل ذکر واقعہ اور کوئی نہیں ہے۔

ذیل میں خواجہ صاحب کی ایک مطبوعہ تحریر نقل کرتا ہوں، غالباً ہو دوں سمجھی جائے گی اور دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

"واحدی صاحب اور بھیّا احسان کے فرقِ تعلق کو بیان کرنا دشوار ہے، میں نہیں چاہتا کہ آئندہ نسلوں کو ان دونوں کی صورت دو رقیبوں کی سی نظر آئے، جیسا کہ بعض اوقات آج کل لوگ قیاس دوڑایا کرتے ہیں مجھے جو تعلق واحدی صاحب سے ہے وہ بھیّا احسان سے قیامت نہیں ہو سکتا اور بھیّا احسان کو جیسا مجھے سمجھنا اور برتنا اور دل لینا اور دل دینا آتا ہے

اُس سے واحدی صاحب حشر تک آگاہ نہیں ہو سکتے۔

میں اِن دونوں کو اپنا سمجھتا ہوں اور یہ دونوں میرے سوا بہت کم لوگوں کو اپنا سمجھتے ہیں۔

بھیّا احسان اور واحدی صاحب کی علمیت میں بے شک فرق ہے مگر بعض باتوں میں واحدی صاحب زیادہ ہیں۔ بعض میں بھیّا احسان بڑھ کر ہیں۔ ہاں میری محبّت کے نقطہ پر دونوں کا اتحاد ہے اور دونوں میری ادبی اور عملی زندگی کو فروغ دینا اور زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

اختلاج کا مرض دونوں کو ہے۔ دلیری اور بے خوفی ایک میں بھی نہیں ہے، میں اپنے جبلّی ولولے سے بے خوف اور نڈر ہو کر بے سوچے جو کام کر جاتا ہوں وہ اِن کو پہلے سے معلوم ہو جائے تو یہ کبھی مجھے اُس کی طرف بڑھنے کی اجازت نہ دیں۔ ان کی احتیاطوں نے مجھ کو اَدھ موا کر دیا ہے۔ لیکن مجھے اقرار کرنا چاہیے کہ اگر ان دونوں کی احتیاطیں اور خاکسار صاحب کی سرپرستی مجھ کو مقید نہ رکھتی تو میں یا تو پھانسی پا چکا ہوتا اور یا نظر بندانِ ہند کے ساتھ کسی جگہ قید ہوتا۔

اخبار توحید میرٹھ کا اجرا

۱۹۱۲ء میں بھیّا احسان الحق نے میرٹھ سے اخبار توحید جاری کیا اور خواجہ صاحب نے اُس کی ادارت کی ذمہ داری لے لی اور میرٹھ چلے گئے۔

لہ بھیّا نے بی۔ اے تک پڑھا ہے اور بھیّا پورے مولوی ہیں، میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ البتہ مجھ میں عملیت بھیّا سے زیادہ ہے، بھیّا میں علمیت ہے اور مجھ میں عملیت۔

اخبار توحید میں خواجہ صاحب کے جوہر اور کھلے اور اُن کے سیاسی خیالات کا اس درجے اظہار ہوا کہ وہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی صف میں شمار کیے جانے لگے۔ جب مسجد کانپور کا قضیہ اُٹھا تو تینوں ایک مقام پر تھے اور یکجہتی سے ہمدرد۔ الہلال اور توحید کی توپوں سے انگریز حکومت کے خلاف گولہ باری کر رہے تھے۔

کہو تکبیر

جامع مسجد میرٹھ میں مسجد کانپور کے مسلمان مقتولوں اور مجروح قیدیوں کی تقریروں کے ذریعہ بھی حمایت کی گئی۔ خواجہ صاحب کی تقریر کا عنوان تھا، "کہو تکبیر" اخبار توحید کا فائل بھیا کے پاس موجود تھا، مگر اور تمام بیش بہا کتابوں کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں لٹ گیا۔ اتفاق سے "کہو تکبیر" کی ایک نقل مل گئی ہے جو درج ذیل کی جاتی ہے:-

ایک تاریخی تقریر

کہو تکبیر

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔ اُس بندوق کی قسم جو ظالم و مظلوم کے ہاتھ میں یکساں کام کرتی ہے۔ اُس سنگین کی قسم جو دوست دشمن دونوں کے سینے میں اتر جاتی ہے۔ اُس تلوار کی قسم جس پر آج غیر کا قبضہ ہے تو کل ہمارا ہو گا۔ اُس پستول کی قسم جو ہر انگلی کے اشارے سے کام کر سکتا ہے۔ ہم کانپوری شہدا کا ماتم کرنے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ہم اُن زخمیوں کی ہمدردی کرنی چاہتے ہیں،

جنھیں کانپور میں بندوق۔ کرچ اور سنگین کا نشانہ بنا دیا گیا۔

اِس مسجد کی قسم جس کے اندر آج ہم سب کلمہ گو صف بند نظر آتے ہیں، کانپوری مسجد کا غم ہمیں یہاں کھینچکر لایا ہے۔ وہ مسجد جو مچھلی بازار میں تھی۔ وہ مسجد جس کا ایک حصہ سڑک سیدھی کرنے کی خاطر زور اور ظلم سے شہید کر دیا گیا۔ وہ مسجد جس کے محبت کرنے والے مسلمانوں کو ۲۹ شعبان کے دن بندوقوں سے دس منٹ لگاتار فیر کر کے خون میں نہلا دیا گیا۔ وہ مسجد جس کے سامنے ہمارے بوڑھے بزرگوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر گریں اور اُن کی سفید داڑھیاں خون سے لال ہو گئیں۔

اُس مسجد کی قسم جس کے سامنے دم توڑنے والے شہیدوں نے کہا "سلام ہمارا مدینے کے سلطان پر جس کے دین کی لاج ہمارا ایمان ہے۔ سلام اُس پر جو حجاز کے اونچے پہاڑوں سے آیا ہے اور ہم کو اپنے سینے کے سہارے لئے بیٹھا ہے اور ہمارے زخموں کو پیار کرتا ہے، جس کے گیسو دراز نواسے حسنؓ اور حسینؓ اِس مقتل میں اپنی سرخ و سبز قباؤں کے دامن بچھا رہے ہیں اور ہمیں اُن پر لٹاتے ہیں اور جن کی بیٹی فاطمہ زہراؓ اپنے باپ کی ہچکیاں لینے والی اُمت کو پانی کے گھونٹ پلاتی پھرتی ہیں اور جس کے طفیل جنت کی حوریں کوثر کے جام لاتی ہیں۔

اُس مسجد کی قسم جس کے اندر سینکڑوں بے گناہ ظلم ستم کی رسیوں سے باندھے گئے اور بھوکے پیاسے جیل خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کئے گئے ہم اس غرض سے یہاں آئے ہیں کہ اپنے کانپوری شہیدوں کی ارواح کو سلام بھیجیں۔ ہم یہاں اس لئے اکٹھے ہوئے ہیں کہ کانپوری زخمیوں کی تیمار داری کی تدبیریں سوچیں۔ اُن کے زخموں کے واسطے مرہم بھجوائیں اور قیدیوں

کو رہائی دلوانے کا سامان کریں اور شہیدوں کے بے کس بال بچوں کو بھوک پیاس کی تکلیف سے بچائیں۔

میرٹھ کے مسلمانو! اسلام تم سے اپنا حق مانگتا ہے۔ کان پور کے مسلمانوں نے اپنا حق جان و مال سے ادا کر دیا۔ وہ مسجد کی بے حرمتی پر کٹ مرے اور قربان ہو گئے۔ تم سے فقط مال کی مانگ ہے تاکہ زخمیوں اور شہیدوں کے پسماندوں اور قیدیوں کے گھر والوں کی مدد کی جائے۔

دوسری مانگ تم سے اور ہے، اُس کو بھی سُنو اور زور سے ایک نعرہ تکبیر بلند کرو۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْد۔ اور وہ طلب یہ ہے کہ سب ایک ہو جاؤ اور ہندستان کے نیکدل وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کو فریاد نامے بھیجو کہ کانپوری حکام نے ہمارے بھائیوں کو ناحق تیغ و تفنگ کا نشانہ بنایا۔ ہماری مسجد کو تلوار کے زور سے ڈھا دیا۔ بے قصور مسلمانوں سے جیل خانے بھر دیے۔ لارڈ ہارڈنگ کو لکھو۔ لندن کی پارلیمنٹ کو لکھو اور اُس کو لکھو جس کا نام جارج خامس ہے اور جو ان ظالم حکام، اور کانپوری مظلوموں کا بادشاہ ہے۔ ہمیں امید ہے وہ کان پور کے ظالم انگریزوں کی جفا کاریوں کو معاف نہیں کرے گا

اللہ کے بندو! ہراساں اور مایوس نہ ہو۔ کمر ہمت مضبوط باندھو آنکھیں دیکھتی ہیں کہ بول بالا ہونے کا وقت نزدیک ہے۔ کان سُنتے ہیں کہ عذاب الٰہی کا بادل گرج رہا ہے۔

کانپوری مسجد کا واقعہ ایسا نہیں ہے جس سے تم بے خبر ہو یا جس کو سُن کر تم سب کے دل میں جوش نہ پیدا ہوا ہو۔ مگر اس ملک میں کچھ انگریز ہیں، جو کہتے ہیں کہ، گنتی کے چند مسلمان اور اخبارات غل مچا رہے ہیں، باقی مسلمانوں

کو تو کانوں کان خبر نہیں ہے، کاش وہ بدنصیب جانے کہ اسلام کے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں وہ بجلی ہے جو انگریزوں کے بے تار کے تار میں نہیں ہے۔ اس میں ایک ایسی لہر ہے جو دنیا کے تمام سمندروں کی موجوں سے زیادہ پرجوش ہے۔ انگریزوں کو یقین کرنا چاہیے کہ سارا ہندوستان کانپور کی مسجد کے معاملے میں ایک دل اور ایک زبان ہے۔

کیا انگریزوں نے نہیں دیکھا کہ بلقان اور طرابلس کے دور دراز ملکوں میں ہمارے بھائیوں کے پھانس چبھتی تھی تو یہاں پردیس میں ہم ہندوستانیوں کے دل پر خنجر چل جاتے تھے، کیا انگریز مسلمانوں کا اور جوش دیکھنا چاہتے ہیں کیا انھیں آرزو ہے کہ مسلمان اپنا اچی تنتین دکھائیں، ان سے کہہ دو کہ ہمارا جوش فیشن اور نمائش کا جوش نہیں ہے جو میز کرسی تک محدود رہے۔ ہم جوش میں آتے ہیں تو آسمان تھرا جاتا ہے۔ سمندر ڈر کر سمٹ جاتے ہیں۔ پہاڑ پست ہوجاتے ہیں دریاؤں کی روانی رک جاتی ہے۔ ہمارا جھنڈا بلند ہوتا ہے تو سینٹ پال کے گرجا کے سوا کہیں اور نصب نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں نہ چھیڑا جائے۔ ہم وفادار لوگ ہیں۔ تم ہم کو نہ ستاؤ اور چپ چاپ اپنا کام کرتے رہو۔ ملکہ معظمہ وکٹوریا کے اس وعدے کا خیال رکھو کہ ہندوستانیوں کے مذہب میں حکومت کبھی مداخلت نہیں کرے گی۔ ہماری کانپوری مسجد بنا دو۔ ہمارے قیدیوں کو چھوڑ دو، ہمارے زخمیوں کو ہمارے حوالے کر دو اور موقع دو کہ ہم امن و اطمینان کے ساتھ اپنے مالک الملوک پروردگار کے آگے سر جھکائیں اور اسکی عبادت کریں۔

اے مسلمانو! سوچو تو آج، جب کہ تم آرام سے اپنے گھروں میں بیٹھے ہو، کانپوری شہیدوں اور زخمیوں کے بال بچوں پر کیا گزر رہی ہوگی

خواجہ صاحب کی شہادت کی افواہ

اس تقریر نے آگ لگا دی اور بلوے کو روکنے کے لئے فوج اور توپ خانے آگئے۔ کسی نے صدر بازار دلی سے مولانا محمد علی کو ٹیلیفون کیا کہ شام تک میں میرٹھ میں تھا۔ خواجہ حسن نظامی کی ایک تقریر سے وہاں ہنگامہ ہو گیا ہے اور خواجہ صاحب کو انگریزوں نے گولی سے شہید کر دیا ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی مسجد چوڑی والان کے ختم قرآن میں جا رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے مجھے بلوایا اور خبر سنائی۔

میں معمولی سفر کرنے کو بھی مہم سمجھتا ہوں، کجا خطرے کا سفر۔ مگر اللہ تعالیٰ نے رات کے وقت اُس جگہ جانے کی ہمت دے دی۔ جہاں کے متعلق کہا گیا تھا کہ گولی چل چکی ہے۔ میرٹھ ریلوے اسٹیشن سے میرٹھ چھاؤنی تک کا غیر آباد راستہ ویسے بھی خطرناک تھا۔ بہرحال بارہ بجے کی گاڑی سے روانہ ہو گیا اور سحری کے قریب دفتر توحید کی کنڈی جا کھٹکھٹائی۔ خواجہ صاحب کو جگایا۔

یہ تقریر اخبار توحید میں چھپی تو حکومت نے اخبار توحید کو بند کرا دیا۔ اور جن جن اخباروں نے اسے نقل کیا وہ بھی ضبط کر لئے گئے۔ لیکن چھاپنے والوں نے اپنے اپنے طور پر چھاپا اور ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ اردو زبان کی شاید ہی کوئی تحریر ہو گی جو اس تقریر کے برابر شائع ہوئی ہو۔

انگریزوں کی حکومت بے اطمینان اور بدگمان تو خواجہ صاحب سے تھی ہی، اخبار توحید نے "اور کہو تکبیر" تقریر نے بے اطمینانی اور بدگمانی کو اور بڑھا کر دیا۔

شبہ کا موقع پہلی دفعہ دربار ۱۹۱۱ء کے موقع پر پیش آیا تھا۔ دربار

کا ایک پروگرام مشائخ وعلماء، اور سادھوؤں اور پنڈتوں کے سلام کا بھی تھا۔ شہنشاہ جارج پنجم اپنی ملکہ کے ساتھ لال قلعہ کے جھروکوں میں بیٹھ گئے تھے اور قلعہ کی دیوار کے نیچے ہندو مسلمان دینی پیشواؤں نے بہ یک وقت جمع ہوکر انھیں سلام کیا تھا اور دعائیں دی تھیں۔ مرزا خورشید عالم[1] ایک تیموری شاہزادے جو پنجاب میں کہیں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ اس تقریب کے مہتمم بنائے گئے وہ خواجہ صاحب کو بلاوا دینے خود تشریف لائے۔ خواجہ صاحب اُس وقت لحاف اوڑھے لیٹے تھے، خواجہ صاحب نے فرمایا۔

صاحب عالم! مجھ سے یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ جہاں سے آپ کے دادا صاحبقراں شاہ جہاں اور عالم گیر اورنگ زیب رعایا کو درشن دیتے تھے، وہاں جارج پنجم براجمان ہوں۔ مجھے تو لحاف میں لیٹا رہنے دیجیے۔ آج کل غضب کی سردی ہے اور لحاف کا لطف درباروں سے زیادہ ہے۔

پھر خواجہ صاحب نے اِس تقریب کا مذاق اُڑایا۔ دینی پیشوا ہاتھیوں پر سوار کراکے جلوس کی شکل میں لائے گئے تھے، خواجہ صاحب نے "نظام المشائخ" میں مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "جُبّہ اور عمامہ کی کورنش" اور اس تقریب کے شرکا کے لیے "اصحاب فیل" کی پھبتی کسی۔ کوئی بزرگ راستے میں ہاتھی سے گر گئے تھے خواجہ صاحب نے اُن کا بھی ذکر کر دیا۔

اِدھر یہ مضمون چھپا، اُدھر میں نے دُرویش پریس اور اخبار درویش کا ڈیکلریشن دے رکھا تھا، اس خیال سے کہ ڈیکلریشن تو ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں داخل ہوا ہے کیوں نہ ڈپٹی کمشنر سے مل لیا جائے۔ شاید وہ ضمانت لینے میں نرمی برتے، میں خواجہ

---

[1] جہاں تک یاد پڑتا ہے یہی نام تھا۔

صاحب کو لے کر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پہنچا۔

میجر بیڈن، ایک درشت مزاج فوجی، ڈپٹی کمشنر تھا۔ وہ ملاقات کے کمرے میں اپنی میز کرسی کے علاوہ کرسی نہیں ڈلواتا تھا۔ ملاقاتی کھڑے ہو کر بات کرتے تھے۔ مولانا محمد علی کے دل میں انگریزوں کے خلاف اسی انگریز نے اشتعال پیدا کیا تھا۔ مولوی سید احمد، امام جامع مسجد تک کو اس سے کہنا پڑا کہ وائسرائے تک کے ہاں بھی میرا احترام ہوتا ہے مجھے پرائیویٹ انٹری Private entery کا اعزاز حاصل ہے، تب بیڈن نے اُن کے واسطے کرسی منگائی۔

ہم دونوں کو اُس نے دور ہی سے للکارا۔ "ویل تم لکھا جبّا عمامہ کورنش" ترجمہ پیش کرو۔

نماز بخشوانے گئے تھے روزے گلے پڑ گئے۔ تین چار دن بعد پھر ہم دونوں حاضر ہوئے اور ترجمہ پیش کیا۔

خواجہ صاحب نے پوچھا مضمون میں اعتراض کی کونسی بات ہے؟ بولا۔ تم لکھا۔ "اصحاب فیل"۔ خواجہ صاحب نے فوراً جواب دیا:۔ اصحاب فیل کے معنی ہیں" ہاتھی والے۔ ہاتھی نشین"۔ یہ تو اچھا لفظ ہے، کیا آپ نے مہمانوں کو ہاتھیوں پر نہیں بٹھایا تھا؟ بیڈن کے دماغ نے یہ جواب تسلیم کر لیا۔

اُسے کسی نے اصحاب فیل کا لفظ تو بتا دیا تھا، مگر مفہوم نہیں سمجھایا تھا۔ خواجہ صاحب کی وضاحت اُس کی سمجھ میں آ گئی۔

بے اطمینانی اور بدگمانی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مصر و شام میں خواجہ صاحب مصر کی آزاد جماعت کے پیشواؤں سے ملے تھے اور بعض ترکوں سے ملے تھے۔ اور سفرنامے میں اس قسم کی تحریریں شائع ہو رہی تھیں۔

"مدینہ منورہ میں شیخ الحرم آج کل ایک ترک ہیں۔ بوڑھے اور بہت ملنسار آدمی ہیں۔ میری اُن کی تخلیئے کی ملاقاتیں ہوئیں اور میں نے اُن سے چند ضروری مسائل مسلمین پر گفتگو کی، خاص کر مسئلہ خلافت کے عملدرآمد پر زیادہ بحث رہی۔ میں نے اُن سے کہا کہ ترکی حکومت خلافت کا خاک کام نہیں کرتی آپ اُسے رغبت دلائے کہ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں کام شروع کیا جائے۔

شیخ الحرم نے حیران ہو کر دریافت کیا کہ کیا کام ہونا چاہیے؟ میں نے کہا آپ کو معلوم ہے کہ آج کل تمام دنیا کے مسلمان ترکی خلافت کو تسلیم کرتے ہیں، اور حضرت سلطان روم کو اپنا مذہبی خلیفہ اور پیشوا مانتے ہیں، مگر یہ عقیدہ بے کار ہے جب تک اس کا عملی ظہور نہ ہو، خلافت کا دارومدار خدمت حرمین پر ہے۔ لہذا سلطان کو چاہیے کہ وہ اپنے نائب کے ذریعہ ہر سال آنے والے حاجیوں سے تعلقات بڑھائیں اور اُن کی مذہبی ضرورتیں معلوم کر کے اُن میں دخل دیں مثلاً بعض ملکوں میں بعض مسائل کے سبب مسلمانوں میں اختلاف ہے، خلیفہ کو چاہیے کہ وہ ان اختلافی مسائل کے بارے میں مسلمانوں کو حکم دیں کہ اختلاف ترک کر کے سب کو متحد ہو کر کام کرنا چاہیے۔ مدینہ منورہ میں خلافت کے زیر اثر ایک دارالافتا قائم کیا جائے جہاں سے تمام اسلامی دنیا کو اس کی ضرورت اور سوال کے وقت فتوے بھیجے جائیں اور ایک ایسا محکمہ خبر رسانی مہیا ہو جو مسلمانوں کے مذہبی حالات کی خبر رکھے اور جس ملک کے مسلمانوں میں کوئی مذہبی کمزوری محسوس کرے خاص فرمان کے ذریعہ اُنھیں ہدایت کی جائے کہ اپنی حالت کی اصلاح کریں۔

ہر سال جو حاجی یہاں آئیں اُن سے نائب خلیفہ اپنے ہاتھ پر امیر المومنین کی اطاعت و تسلیم خلافت کے لئے بیعت لیں اور اُن میں سے چند کو اجازت دی جائے کہ اپنے ملکوں میں جا کر خلیفہ کے نام پر بیعت لیں۔

آخر میں اگرچہ لکھ دیا گیا تھا کہ "اس بیعت کو ملکی و سیاسی معاملات میں دخل نہ ہونا چاہیئے بلکہ اطاعتِ خدا و رسولؐ اور اطاعت حکم خلیفہ اور بجا آوری فرائض دین کے لیے بیعت لی جائے۔" مگر بجا آوری فرائض دین اور اطاعت حکم خلیفہ کیا کم معنی خیز ہیں اور انگریزی قوم بھلا ان باتوں میں آنے والی ہے۔

توجیل کے مضامین اور کچھ تکبیر قسم کی تقریروں نے خواجہ صاحب کے دلی جذبات بالکل الم نشرح کر دیئے۔ شبہ یقین سے بدل گیا۔

انگریز ہاتھ سوچ سمجھ کر ڈالتے تھے۔ خواجہ صاحب کی گرفت نہیں کی گئی نگرانی شروع کر دی گئی۔

سی۔ آئی۔ ڈی کا ایک آدمی ۱۹۱۱ء میں سفر سے آتے ہی پیچھے لگ گیا تھا اسی نے تو رپورٹ کی تھی کہ لارڈ ہارڈنگ کے جلوس میں خواجہ صاحب فوارے کے اس جانب نہیں، اُس جانب تھے۔ نگرانی کی سختیاں روز بروز بڑھتی رہیں، حتیٰ کہ خواجہ صاحب کو سفر کرنا مصیبت ہو گیا۔ رات میں سونے نہ دیا جاتا تھا ہر اسٹیشن پر جگا کر سوال جواب کئے جاتے تھے۔ نگرانیوں نے حلقۂ المشائخ کا خاتمہ کر دیا۔ اُس کے ہفتہ وار جلسے بند ہو گئے۔ نگرانی ۱۹۱۷ء تک رہی۔

میں شملہ میں تھا خواجہ صاحب نے حیدر آباد سے خط لکھا کہ یہاں شملہ سے زیادہ بہار ہے۔ یہاں آؤ۔ میں دلی پہنچا اور دلی سے حیدر آباد روانہ ہو گیا۔ رات کے نو بجے روانہ ہوا تھا۔ بارہ بجے گھر والوں کو تار ملا کہ "مت آؤ۔" جواب دے دیا گیا کہ تار روانگی کے بعد ملا ہے۔

خیر مجھے سیٹھ محمد موسیٰ تاجر سکندر آباد۔ دکن کے آدمیوں نے حیدر آباد کی بجائے سکندر آباد میں اُتار لیا اور کہا کہ خواجہ صاحب حیدر آباد سے سکندر آ رہے ہیں۔ اُن ہی نے ہمیں بھیجا ہے کہ آپ کو سیٹھ صاحب کے ہاں لے آئیں۔

خواجہ صاحب نے اگر فرمایا۔ ریل کے ذریعہ تمہارا حیدر آباد جانا مناسب نہ تھا اب موٹر میں چلو۔ میں تو آج بمبئی چلا جاؤں گا، تم جب تک جہاں چاہو ٹھیرو جب جی بھر جائے، بمبئی آجانا۔

خواجہ صاحب نے حیدر آباد ریلوے اسٹیشن پر بہت پریشانی اُٹھائی تھی۔ خواجہ صاحب نے خیال کیا کہ ریاست کی سی۔ آئی۔ ڈی پولس مجھے بھی پریشان کرے گی۔

مشتبہ خواجہ صاحب انگریز کی نظر میں تھے لیکن انگریز اپنی حدودِ مملکت میں اتنا نہیں ستاتا تھا جتنا حیدر آباد ریلوے اسٹیشن پر ستایا گیا۔ سکندر آباد ریاست کا جزو ہونے کے باوجود انگریزوں کے زیرنگیں تھا۔ وہاں نظام کی حکومت نہیں تھی۔

خواجہ صاحب حیدر آباد میں مہاراجہ سر کشن پرشاد، ریاست کے وزیر اعظم کے مہمان تھے۔ اُن کے مہمان کا ریاست کی سی۔ آئی۔ ڈی نے لحاظ نہیں کیا تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے سامنے مہاراجہ بے دست دپا تھے۔ خیر میں شام تک خواجہ صاحب کے ساتھ مہاراجہ کے ہاں رہا۔ شام کی ٹرین سے خواجہ صاحب بمبئی چلے گئے اور میں مولوی غلام یزدانی[۱] ڈائرکٹر جنرل، محکمہ آثار قدیمہ ریاست حیدر آباد کے ہاں چلا گیا۔

دوسرے دن سہ پہر کو چارپائی پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ دیکھا کیا ہوں خواجہ صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ہیں! آپ کیسے فرمایا اعلیٰ حضرت

۱؎ مولوی غلام یزدانی دلّی کے حضرت میاں عبدالصمد رح کے داماد ہیں دلّی کے قدیمی باشندے ہیں، مگر اب حیدر آباد میں رہتے ہیں۔

حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے بلایا ہے۔

قصہ یہ تھا کہ انگریز ریذیڈنٹ نے کہیں نظام سے اشارۃً کچھ کہہ دیا تھا
نظام نے مہاراج کو ٹیلیفون کیا اور خواجہ صاحب نے مہاراج کی گفتگو سن لی۔
اور مہاراج صاحب سے کہا۔ آپ اپنی پوزیشن کو خطرے میں نہ ڈالیئے اور مجھے
بمبئی جانے کی اجازت دیجئے۔ مہاراج روکتے رہے لیکن خواجہ صاحب نہ مانے
اور فیصلہ کر لیا کہ حیدرآباد میں نہیں ٹھیروں گا۔ صرف میرے پہنچنے کا انتظار
تھا۔ میرے پہنچتے ہی پہلی ٹرین سے حیدرآباد کو خیرباد کہہ دیا۔

مہاراجہ کشن پرشاد قدیم وضع داری اور شرافت کا مجسمہ تھے، ان کے
ہاں سے کبھی کوئی مہمان اس طرح سے نہیں گیا تھا۔ سوچتے رہے سوچتے رہے
آخر ٹیلیفون اٹھایا اور حضور نظام، میر عثمان علی خاں سے عرض کیا کہ خواجہ
صاحب رخصت ہو گئے ہیں، لیکن میرے دل میں ایک پھانس سی چبھ رہی ہے
یہ انگریز اپنی مملکت میں تو خواجہ صاحب کا رہنا گوارا کرتے ہیں لیکن اسلامی
سلطنت میں رہنا گوارا نہیں کرتے۔ خواجہ صاحب مسلمانوں کے پیشوا ہیں
مسلمان جب سنیں گے کہ اسلامی سلطنت نے انھیں رہنے نہیں دیا، تو کیا
کہیں گے؟ انگریز ریذیڈنٹ نے حضور کو بدنام کرنے کے لئے ایک چال کھیلی
ہے۔ اس کا اور اس کی قوم اور حکومت کا کچھ نہیں بگڑا۔ مسلمان حضور سے
بدظن ہو جائیں گے۔

مہاراج نے ایسی لچھے دار گفتگو کی کہ حضور نظام نے بے اختیار پوچھا،
خواجہ صاحب اس وقت کہاں ہوں گے ٹائم ٹیبل دیکھ کر بتایئے۔ مہاراج
نے ٹائم ٹیبل دیکھا اور بتایا کہ فلاں وقت فلاں جگہ ٹرین پہنچے گی۔ حضور نظام
نے فرمایا۔ وہاں کے اسٹیشن ماسٹر کو تار دیجئے کہ خواجہ صاحب کو واپس کرے،

میں خواجہ صاحب سے ملوں گا۔ چنانچہ حضور نظام خواجہ صاحب سے ملے۔ کئی روز مہمان رکھا۔ پانچ سو روپے نذر پیش کی اور پھر حضور نظام کے اور خواجہ صاحب کے بڑے مخلصانہ تعلقات رہے۔

حضور نظام خواجہ صاحب کو دو سو روپے ماہوار وظیفہ بھی دیتے تھے۔

حضور نظام ایک دفعہ خواجہ صاحب کے گھر بھی تشریف لائے۔

خواجہ صاحب کے کہنے سے متعدد صاحبزادگانِ درگاہ حضرت سلطان المشائخ کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا، جس کی میزان غالباً تین سو روپے ماہوار تھی۔

ایک تیموری شہزادہ خواجہ صاحب کے پاس ملازم تھا۔ اسے خواجہ صاحب خود معقول تنخواہ دیا کرتے تھے اور ریاست حیدر آباد سے پندرہ روپے ماہوار الگ دلواتے تھے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے میرے لئے درخواست بھیج دی۔ مجھے اس کا جب علم ہوا جب مہاراجہ سر کشن پرشاد کا تار آیا کہ واحدی صاحب کا وظیفہ منظور ہو گیا ہے۔ یہ وظیفہ پاکستان پہنچ جانے کے بعد بھی پہنچتا رہا۔ یہاں یہ وظیفے کے روپے اشرفیاں بن کر کام آئے۔

مملکت کا حکمران اُتنا لحاظ برتتا تھا تو مملکت کے عوام و خواص جتنا اثر مانتے کم تھا۔ خواجہ صاحب یوں تو سارے ملک ہی میں مقبول تھے لیکن حیدر آباد کی مقبولیت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور خواجہ صاحب کا اثر پائدار تھا۔ حضور نظام کبھی بگڑ بھی جاتے تھے تو خواص تک اس بات کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ عوام تو کیا پرواہ کرتے۔ حالانکہ شروع میں، میں نے حیدر آباد کے خواص نہیں مشائخ کا عجیب رنگ دیکھا تھا۔

میں جس دن بلدہ پہنچا ہوں اُس دن شام تک خواجہ صاحب مجھے بلدہ کے

اونچے اونچے مشائخ سے ملاتے پھرے اور اُن سے وعدے لیتے رہے کہ نظام المشائخ کی اشاعت بڑھانے میں میری اعانت کریں گے۔ سب نے کہا۔ یہ کل آجائیں، ہم دل وجان سے حاضر ہیں۔ اُنھیں اُس وقت معلوم نہیں تھا کہ خواجہ صاحب نظام کو کھٹک چکے ہیں اور شام کو بمبئی جانے والے ہیں۔

دوسرے دن میں مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اوّل سے لے کر آخر تک سب کا رنگ بدلا پایا۔ اِن تلوں تیل ہی نہ تھا، گویا کل جو میری ساتھ بچھے جاتے تھے، آج وہ سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔ لیکن خواجہ صاحب کا اثر جم جانے کے بعد یہ حال نہیں رہا تھا۔ بایں ہمہ اب تک کا عروج اُس عروج کے مقابلے میں جو اللہ تعالیٰ نے خواجہ صاحب کو آگے چل کر عطا فرمایا معمولی عروج تھا۔

تصنیف وتالیف پر زور

نگرانی کی پریشانی دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ خواجہ صاحب نے سیاست میں جتنا حصہ لیا اُس کا تعلق سیاست سے برائے نام تھا، اُس کا تعلق مذاہب سے تھا، میں نے اور بھیا احسان الحق نے خواجہ صاحب کی خدمت میں مشورہ پیش کیا کہ جو سیاست رواج پا رہی ہے اُسے آپ نباہ نہیں سکیں گے، اب وہ کام کیجئے جسے بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ آپ تصنیف وتالیف پر پوری توجہ دیجئے۔ توجہ اِدھر اُدھر مٹ بانٹیے۔ کتابوں میں اپنی طبیعت کے مطابق سیاست بھی لائیے! اُسے استقلال حاصل ہوگا۔ وقتی اور ہنگامی سیاست تو ہوا میں اُڑ جاتی ہے۔ نیز آپ انگریزوں سے بگاڑیئے نہیں انگریزوں سے ملئے تاکہ اطمینان کے ساتھ تصنیف وتالیف کرتے رہیں۔

خواجہ صاحب کے بزرگوں، پیرزادہ سید محمد صادق[۱]

---

۱ خواجہ صاحب کے ماموں زاد بھائی اور خواجہ بانو کے والد۔

اور منشی غلام نظام الدین[۲] نے میری اور بھتیا احسان کی تائید کی اور خواجہ صاحب نے وقتی اور ہنگامی جلسوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور کونے میں بیٹھ کر کتابیں لکھنی شروع کیں اور دلی کی حکومت سے بگاڑ رکھنے کی بجائے تعلقات بڑھائے۔ تعلقات بڑھانے کے خواجہ صاحب بادشاہ تھے، ابتدا ہی میں ان تعلقات کا نتیجہ ظاہر ہوا۔

خواجہ صاحب نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے سلسلہ کی پہلی کتاب "بیگمات کے آنسو" لکھی اور مسٹر میلکم ہیلی کو دی جو اُس وقت دلی کے چیف کمشنر تھے (بعد میں یو۔پی اور متحدہ پنجاب کے گورنر اور سر ہیلی اور لارڈ ہیلی بنے۔) خواجہ صاحب نے ہیلی صاحب سے کہا کہ ذرا اسے دیکھ لیجئے یا دکھوا لیجئے اور چھاپنے کی تحریری اجازت دے دیجئے۔ آج کل چونکہ جنگ (عظیم) کا زمانہ ہے احتیاطاً آپ کی اجازت چاہتا ہوں۔

خواجہ صاحب ہیلی صاحب سے دوبارہ ملے تو ہیلی صاحب نے پوچھا:۔
"اس کتاب سے مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف اشتعال تو نہیں پیدا ہو جائیگا"
خواجہ صاحب تعلّقات بڑھانے اور دوسرے کو اپنا گرویدہ کر لینے ہی کے بادشاہ نہیں تھے، جواب دینے کے بھی بادشاہ تھے، خواجہ صاحب نے بلا توقف جواب دیا۔

"میری رائے میں تو اُلٹا اثر ہوگا، مسلمان سمجھ لیں گے کہ بغاوت کرنے کا کیا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے"۔

اجازت مانگنا خود کچھ کم نفسیاتی حربہ نہیں تھا، پھر خواجہ صاحب کا برجستہ جواب، ہیلی صاحب نے اجازت لکھ کر دیدی۔

خواجہ صاحب انقلاب ۱۸۵۷ء کے سلسلہ کی تیرہ یا چودہ کتابیں یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ اِن کتابوں کا شائع ہونا ممکن نہ تھا اگر خواجہ صاحب وقتی اور ہنگامی سیاست

---

[۲] عرف خاکسار عالم۔

میں حصہ لیے چلے جاتے۔ ان کتابوں کو پڑھنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کتنی کارآمد کتابیں ہیں۔ اکبر الہ آبادی جو بیج ظریفانہ اشعار کے ذریعہ بویا کرتے تھے وہی بیج خواجہ صاحب نے دلچسپ افسانوں سے بویا ہے۔ اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے سلسلہ کی سب کتابیں افسانے نہیں ہیں۔ ان میں بہادر شاہ کا مقدمہ قسم کی کتابیں بھی ہیں۔

سیاست سے الگ ہو کر بھی خواجہ صاحب کو کبھی کبھی سیاست کی ہڑک اٹھتی تھی۔ کبھی اخبار، رسالے نکال دیتے تھے۔ کبھی بیان دے دیتے تھے۔

ایک مسیح الملک حکیم اجمل خاں تو ایسے شخص گزرے ہیں کہ سیاست میں پڑے اور سیاست کے اعلیٰ ترین مراتب تک پہنچے اور ان کی ہر دلعزیزی میں فرق نہیں آیا۔ ورنہ سیاست بڑی گندی چیز ہے۔ جیسے بٹی پلید کرانی ہو، وہ سیاست میں پڑے۔ لوگ وزارت کی کرسیوں پر بیٹھ کر بھی تو عزت نہیں پاتے۔ اقتدار ضرور پا لیتے ہیں۔ خواجہ صاحب اس کبھی کبھی کی سیاست سے بھی دور رہتے تو بڑا اچھا کرتے۔ مگر خیر ننانوے فی صدی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف تھی۔ خواجہ صاحب خلق تصنیف و تالیف کیلئے کیے گئے تھے، کتابوں کا مہینہ برسا دیا۔ ۱۹۱۱ء میں فقط شیخ سنوسی کے مصنف تھے۔ ۱۹۱۹ء میں چھوٹی بڑی چھیالیس کتابوں کے مصنف ہو گئے اور رحلت کے وقت پانچ سنو کے قریب کتابوں کے مصنف تھے۔

خواجہ صاحب کی کتابوں کو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اردو کی کوئی کتاب اس زمانے میں خواجہ صاحب کی کتابوں سے زیادہ نہیں بکتی تھی۔ سوائے مولانا راشد الخیری کی "شام زندگی" کے جسے میں نے شائع کیا اور جس کے تابڑ توڑ اٹھارہ ایڈیشن میرے زیر اہتمام چھپے تھے۔

خواجہ صاحب کی ایک اور حاضر جوابی

اوپر خواجہ صاحب کی حاضر جوابی کا ذکر آیا ہے۔ ایک اور واقعہ حاضر جوابی

مُصر ہے کہ مجھے بھی یہیں ذبح کردو۔ پھر بادر ہے نہ رہے۔

آصف جاہ آخر نظامِ دکن میر عثمان علی خاں کے شیعیت کے چرچے آپ نے سُنے ہوں گے۔ اُن کے اجداد سُنی تھے لیکن وہ باضابطہ تو نہیں، بے ضابطہ شیعہ ہیں خواجہ صاحب کسی قدر تفضیلی تھے۔

ایک روز میر عثمان علی خاں نے خواجہ صاحب سے سوال کیا۔ ترتیب خلافت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ خلیفہ اول۔ حضرت عمر فاروق رضؓ خلیفہ دوم۔ حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ سوم اور اور حضرت علی مرتضیٰؓ خلیفہ چہارم۔ میر عثمان علی خاں نے تیوری چڑھا کر کہا۔ آپ حضرت علی رضؓ کو چوتھا خلیفہ بھی مانتے ہیں اور اُن کی فضیلت کے بھی قائل ہیں، یہ عجیب قسم کی فضیلت ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم آخری رسول ہونے کے باوجود تمام انبیا پر فائق تھے اور تمام انبیا کے اوصاف کے جامع تھے۔ لہذا ترتیب میں چوتھا ہونا حضرت علیؓ کی فضیلت کو کم نہیں کرتا۔

خلافت کی ترتیب تو حقیقت ہے اُس سے انکار کس طرح کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صوفیا کو زیادہ تر حضرت علیؓ سے فیض پہنچا ہے۔ ہم لوگ حضرت علی رضؓ کی روحانی فضیلت کے قائل ہیں۔ باقی جو عروج اسلام نے پہلے تین خلفار کے دور میں پایا اُس کی بنا پر میں اُن تینوں کو خلفائے برحق مانتا ہوں"۔

میر عثمان علی خاں نے کہا۔ خواجہ صاحب! آپ کی رائے بالکل صحیح ہے۔ میرے دل میں کھٹک سی تھی۔ آپ نے کھٹک دور کردی۔

خواجہ صاحب کے بڑے بڑے ملاقاتی

حاضر جوابی کی اتنی تفصیل بیان کی ہے تو ملاقات بڑھانے کا حال بھی سنائیے

کے ساتھ کیوں نہ عرض کردوں۔ میں نے اوپر خواجہ صاحب کو ان دونوں باتوں کا بادشاہ بتایا ہے

خواجہ صاحب کی آنکھوں میں موہنی تھی، خواجہ صاحب کی زبان میں موہنی تھی، خواجہ صاحب کی شخصیت میں موہنی تھی خواجہ صاحب از سرتاپا موہ لینے والے تھے۔

میں نے گزشتہ صفحات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"میں تین معمولی سفروں میں (جو خواجہ صاحب کے ہمراہ کیے گئے تھے) اتنے آدمیوں سے روشناس ہوگیا اور بڑے بڑے آدمیوں سے روشناس ہوگیا تو خواجہ صاحب کو تو اللہ تعالیٰ نے روشناسی کے واسطے پیدا کیا تھا۔ انھیں سفر کے ذریعہ کروڑوں آدمیوں سے روشناسی حاصل ہوئی۔ اور بڑے آدمیوں میں کون تھا جو اُن کا شناسا نہ ہو۔ وہ خود بڑے آدمی تھے۔ لیکن سب بڑے آدمی آپس میں ایک دوسرے سے ایسے قریب نہیں ہوتے جیسے اُن سے قریب تھے۔ اُن کے اندر خداداد کشش تھی، اُنکی طرف چھوٹے بڑے سب اس طرح کھنچتے تھے جس طرح مٹھاس کیطرف چیونٹیاں کھنچتی ہیں۔

ایک دن، شام کے وقت، میں اور خواجہ صاحب حضرت سلطان المشائخ کی بہن اور والدہ کا مزار دیکھنے گئے۔ خواجہ صاحب مزار کی مرمت کرا رہے تھے۔ یہ مقام "بیوی نور" کے نام سے مشہور ہے

بیوی نور دہرولی سے، جہاں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کا مزار ہے، بالکل نزدیک ہے۔ میں نے عرض کیا آیا تو ہوں مولانا راشد الخیری سے ملتا چلوں۔ مولانا مع اہل وعیال اکثر دہرولی جایا کرتے تھے۔

خواجہ صاحب قطب پارک میں لاٹھ کے نیچے ٹھیر گئے اور میں بستی

میں مولانا سے ملنے چلا گیا۔ جب چلا ہوں تو خواجہ صاحب، اور خواجہ صاحب کے موٹر ڈرائیور شہاب الدین کے سوا آدمی کا کہیں نشان نہیں تھا۔ لیکن جب واپس آیا تو خواجہ صاحب کے سامنے ساٹھ ستر آدمی حلقہ کئے بیٹھے تھے۔ واپسی میں شاید بیس منٹ نہ لگے ہوں گے۔ مولانا کے ہاں میں رکا نہیں تھا، آواز دی اور مولانا باتیں کرتے میرے ساتھ قطب پارک آ گئے۔ بیس منٹ میں آدمی چینوٹیوں کی طرح نکل پڑے۔"

خواجہ صاحب کے ملاقاتیوں کی مکمل فہرست مرتب کرنی ناممکن ہے بہرحال ان خاص ملنے والوں میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو خواجہ صاحب کا صرف لحاظ اور regard ہی نہیں کرتے تھے، ادب کرتے تھے اور بعض کو تو اس قدر اعتقاد تھا کہ اہل دول اور اہل اقتدار سے اُس کی توقع کم کی جاتی ہے۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد، مدار المہام سلطنت نظام خواجہ صاحب کے سامنے حقہ نہیں پیتے تھے اور ہاتھ باندھے بیٹھے رہتے تھے یا پان بنا بنا کر کھلاتے رہتے تھے .... الدولہ .... نے اپنے سونے کے کمرے میں مسہری کے سرہانے اونچی جگہ پر خواجہ صاحب کی جوتیاں رکھ چھوڑی تھیں۔

نوابوں اور راجاؤں کے ساتھ خواجہ صاحب کا کیا رنگ تھا

ہر ریاست نے خواجہ صاحب کو درباری لباس سے مستثنیٰ کر رکھا تھا۔ خواجہ صاحب درباروں میں وہی لمبا کرتا اور پنج گوشی ٹوپی پہنکر شریک ہوتے تھے میں نے خواجہ صاحب کو ہندوستان کے راجہ، نوابوں اور افغانستان کے بادشاہ سے ملتے اور باتیں کرتے دیکھا ہے۔ راجہ نواب اور بادشاہ کچھ جھکا ؤ

کھاتے تھے مگر خواجہ صاحب جھکاؤ نہیں کھاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اس نوعیت کی ادائیں برداشت کر لیتے تھے۔

میں ایک دفعہ خواجہ صاحب کے ساتھ اُن مہاراجہ الور کا مہمان تھا جن کے علم و فضل اور جن کی اکڑ اور متعدد خوبیوں اور خرابیوں کی دھوم تھی۔ جنھوں نے وائسرائے سے تن کر مصافحہ کیا تھا اور جنھیں گدی سے اُتار دیا گیا تھا۔ نام صحیح یاد نہیں۔

مہمان ہونا اور شئے ہے اور ساتھ کھانا کھانا اور شئے۔ مجھے دو مرتبہ ساتھ کھانے کی عزت عطا کی گئی۔

مہاراجہ الور میزبان کی نشست پر تشریف فرما تھے۔ اُن کے دائیں جانب کوئی فرنگن تھی، اور بائیں جانب خواجہ صاحب۔ میرا نمبر گیارھواں یا بارھواں تھا کھانے پہ کھانے آرہے تھے، لیکن کھانا لیا کم جاتا تھا اور فرنگن اور خواجہ صاحب تو مطلق نہیں لیتے تھے۔ دونوں جانب کے نمبر دو برائے نام لیتے تھے۔ نمبر تین نمبر ۲ سے زیادہ اور نمبر چار نمبر تین سے زیادہ۔ مجھ گیارھویں بارھویں نمبر والے نے بھی اتنا نہیں لیا کہ پیٹ بھر جاتا۔ پیٹ غالباً پچیسویں نمبر والے تک کا نہ بھرا ہوگا دونوں جانب پچیس پچیس مہمان ہوتے تھے، اکیاونویں خود مہاراج۔

معلوم ہوا مہاراجہ الور کی یہ ادا ہے کہ کھانے کے لئے بلا تو لیتے ہیں، مگر چونکہ بولے چلے جاتے ہیں۔ اتنا بولتے ہیں کہ کھانے کی نوبت نہیں آتی۔ مہمان خصوصی ان کی پوری اتباع کرتا ہے اور باقی مہمان قرب و بُعد کے حساب سے پاؤ، آدھا پیٹ بھرتے ہیں دونوں مرتبہ مہاراج خواجہ صاحب سے تصوف پر مسلسل گفتگو کرتے رہے اور نہ خود کھایا نہ خواجہ صاحب کو کھانے دیا۔

نوابوں راجاؤں کو نہ جانے کن کن الفاظ کے ساتھ مخاطب کیا جاتا تھا۔

حضور۔ سرکار۔ اَن داتا۔ پربھو وغیرہ وغیرہ۔ اور کیسے کیسے لوگ یہ الفاظ کہتے تھے کیا بتاؤں۔ مگر خواجہ صاحب کی زبان اِن الفاظ سے آشنا نہیں تھی۔ خواجہ صاحب نے نوابوں اور راجاؤں کو نیازمندی بنائے رکھا اور خواہرزادگیِ حضرت سلطان المشائخ کے ٹھیس نہیں لگنے دی۔

تعلقات قائم ہوجانے کے بعد خواجہ صاحب حتی المقدور تعلقات بگڑنے نہیں دیتے تھے۔ لیکن دوسرا خواہ مخواہ بگڑجاتا تو اُسے مناتے بھی نہیں تھے۔ چنانچہ یہی مہاراجہ الور بگڑ گئے۔ خواجہ صاحب نے اُنھیں نہیں منایا۔ خواجہ صاحب کا ایک صاحب سے قصہ چل رہا تھا۔ مہاراجہ نے اُن صاحب کو خواجہ صاحب سے ملنے پر آمادہ کرلیا۔ اور خواجہ صاحب کے کمرے میں آکر خواجہ صاحب کو آمادہ کرنا چاہا۔ مگر خواجہ صاحب نے ملنے سے انکار کردیا۔ خواجہ صاحب اور دوسرے صاحب مہاراج کے ہاں مقیم تھے بھلا راجہ، نواب اتنی تاب کب لاسکتے ہیں کہ اُن کی خواہش ٹھکرادی جائے۔ مہاراجہ نے خواجہ صاحب کو بلانا چھوڑدیا۔ خواجہ صاحب نے پرِکاہ کے برابر پرواہ نہیں کی۔

خواجہ صاحب نوابوں اور راجاؤں کی حالت، اپنی طرف سے نہیں، نواب رامپور رضا علی خاں کی طرف سے سُنایا کرتے تھے۔ نواب رامپور کسی دن موج یا موڈ میں آگئے اور اپنے وزیراعظم مسٹر زیدی سے بولے۔ بھئی زیدی ہم چاہتے ہیں کہ خواجہ صاحب کو موٹر دیں۔ تم آج ہی اس کا بندوبست کرو۔ ہم رئیسوں کا کیا اعتبار۔ آج خوش ہیں۔ کل ناخوش ہوجائیں۔

لیکن خواجہ صاحب سے سوائے مہاراجہ الور کے کسی راجہ نواب نے کبھی رُخ نہیں بدلا۔ اور مہاراجہ الور کا رُخ بدلنا بھی، رُخ بدلنا نہ تھا۔ معمولی کھنچاؤ تھا، جو خواجہ صاحب چاہتے تو اشاروں میں دُور کردیتے۔

نواب رامپور خواجہ صاحب کو ہر مہینے کئی کئی بار بلاتے تھے۔ اور خواجہ صاحب

جتنے روز اُن کے ہاں ٹھیرتے تھے، پانچ سو روپے روز کے حساب سے نذر پیش کرتے تھے

خواجہ صاحب اور حضرت اکبر الٰہ آبادی

خواجہ صاحب کو خُردانہ ملتے ہوئے میں نے بس حضرت اکبر الٰہ آبادی کے ساتھ دیکھا، بڑے بھائی خواجہ سید حسن علی - ماموں زاد بھائی - اور خسر پیرزادہ سید محمد صادق اور مخلصِ خاص منشی غلام نظام الدین عرف خاکسار عالم کی بزرگی کا بھی لحاظ کیا جاتا تھا، مگر حضرت اکبر کا خواجہ صاحب ادب کرتے تھے - مجھے الٰہ آباد جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا - وہاں ممکن ہے حضرت اکبر زیادہ تکلف نہ برتنے دیتے ہوں، لیکن اپنے گھر میں اور میرے گھر میں خواجہ صاحب ہمیشہ حضرت اکبر کے سامنے چھوٹوں کی طرح بیٹھتے تھے - حضرت اکبر مسند پر گاؤ تکیے سے پیٹھ لگائے ہوتے تھے اور خواجہ صاحب مسند کے کنارے پر رہتے تھے، بلکہ مسند سے باہر -

اسی طرزِ نشست کا وہ مشہور و معروف دلچسپ واقعہ ہے کہ حضرت اکبر کا منہ کمرے کے دروازے کی طرف تھا اور خواجہ صاحب کا منہ حضرت اکبر کی طرف - میں بھی حاضر تھا - یکایک حضرت اکبر نے فرمایا "آیئے - آیئے" خواجہ صاحب اور میں نے مڑ کر دیکھا تو دو طوائفیں ہمارے پیچھے کھڑی تھیں - خواجہ صاحب کا حکم تھا کہ جب تک حضرت اکبر ہیں کسی طوائف کو گھر میں مت گھسنے دینا - ویسے مستقل ممانعت نہ تھی - فقیروں کے ہاں اچھے بُرے کی روک ٹوک نہیں ہوا کرتی - وہ دو طوائفیں خدا جانے کس طرح آنکھ بچا کر اندر پہنچ گئیں - خیر خواجہ صاحب نے گھس آنے پر بھی اُنھیں واپس کیا - اُن کے جانے کے بعد حضرت اکبر نے بغیر مسکراتے ہوئے کہا "میں تو سمجھتا تھا اس گھر میں فقط فرشتے نازل ہوتے ہیں لیکن آج تو حوریں بھی اُتر آئیں -" اور بیساختہ[۱]

[۱] شعر حضرت اکبر بے ساختہ ہی فرمایا کرتے تھے - سنہ ۱۹۱۲ء میں میری شادی کا (باقی صفحہ ۱۳۷ پر)

ایک شعر تصنیف کر دیا ؎

فقیروں کے گھروں میں لطف کی راتیں بھی آتی ہیں
زیارت کے لئے اکثر مستماتیں بھی آتی ہیں

یہ طرز نشست خواجہ صاحب کا دیوان صاحب اجمیر شریف سید آل رسول کے ساتھ بھی تھا۔ لیکن اس ادب و تعظیم کی وجہ دیوان صاحب کی شخصیت نہیں تھی۔ حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نواز کی گدی تھی۔ حضرت اکبر جیسی عزت خواجہ صاحب نے کی ہوگی تو اپنے پیروں کی کی ہوگی۔ قصہ یہ تھا کہ پیروں کو خود مریدی پیرزادگی کا لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ حضرت اکبر اس اٹیکیٹ کے لئے مجبور نہ تھے۔

خواجہ صاحب نے لکھنا مولوی عبدالحلیم شرر کی کتابوں سے سیکھا تھا۔ اس کا انھوں نے بارہا اظہار فرمایا۔ دوسرے استاد خواجہ صاحب کے شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد تھے، یا اُن کی کتابیں تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ مولوی محمد حسین آزاد کہیں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۶ دعوت نامہ گیا تو حضرت اکبر نے اس کی رسید یہ شعر لکھ کر دی ؎

واحدی کو دولہی مبارک ہو
یعنی شادی ہوئی مبارک ہو

حضرت اکبر خواجہ صاحب کو الہ آباد بلا رہے تھے اور خواجہ صاحب متعدد تقاضوں کے باوجود جا نہ سکتے تھے۔ حضرت اکبر نے میرے نام کے خط میں اس بات کی شکایت کی اور لکھا ؎

خواجہ حسن نظامی سے دلی نہ چھٹ سکی
حضرت ابوہریرہ سے بلی نہ چھٹ سکی

کلام اکبر میں آورد نام کو نہیں تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اشعار اور اعلیٰ سے اعلیٰ طویل نظموں تک میں بیساختگی ہے۔ حتیٰ کہ نظموں کے ترجمے بیساختگی سے کئے ہیں، ترجموں کو اصل نظموں سے بڑھا دیا ہے۔

ہاتھ لگ جاتے تو اُن سے بھی حضرت اکبر کا سا برتاؤ کیا جاتا لیکن مولوی عبدالحلیم شرر سے بالکل مساویانہ برتاؤ تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر روزنامہ ہمدرد کی ایڈیٹری کرنے دلّی آئے ہیں تو میرے ہم محلہ تھے۔ میں نے اُن کا اور خواجہ صاحب کا ملنا دیکھا ہے۔

خواجہ صاحب کی عمر میں اور حضرت اکبر کی عمر میں بڑا تفاوت تھا۔ خواجہ صاحب حضرت اکبر کے بیٹے سیّد عابد حسین سے چھوٹے تھے۔ حضرت اکبر سے خوردانہ مشورے مانگتے تھے اور حضرت اکبر بزرگانہ مشورے دیتے تھے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا تو خواجہ صاحب اُسے حضرت اکبر کے علم میں ضرور لاتے تھے۔

میں نے حضرت اکبر کے دوسرے بیٹے سید عشرت حسین (کلکٹر) کے مسودات سے حیات اکبر مرتب کی ہے اُس کے دیباچے میں خواجہ صاحب نے اس قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ یہ واقعہ میں اپنے الفاظ میں پہلے بیان کر چکا ہوں لیکن بطور قند مکرر خواجہ صاحب کے الفاظ میں پھر پڑھ لیجیے۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں کنگ جارج پنجم کا دربار ہوا۔ یو۔ پی اور پنجاب کے علماء و مشائخ بھی اس دربار میں بلائے گئے۔ مجھے تیموری شہزادہ خورشید مرزا، اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے ذریعہ دلّی کے ڈپٹی کمشنر نے کہلا کر بھیجا کہ سب علماء و مشائخ ہاتھیوں پر سوار اجلوس کی شکل میں جمنا کی ریتی میں جائیں گے اور کنگ جارج لال قلعہ کے ثمن برج میں بیٹھیں گے اور علماء و مشائخ ہاتھیوں پر بیٹھے بیٹھے کنگ جارج کو سلام کریں گے۔ میں نے بُلاوا قبول نہیں کیا اور دربار کی شرکت کا کارڈ آیا تو دربار میں بھی نہیں گیا۔

دربار کے بعد میں نے نظام المشائخ میں ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا "جبہ و عمامہ کی کورنش" اس مضمون میں لکھا کہ جو

علماء و مشائخ ہاتھیوں پر بیٹھ کر انگریز بادشاہ کو سلام کرنے گئے تھے وہ سب اصحاب فیل تھے۔ بعض علماء و مشائخ نے میجر ہیڈن ڈپٹی کمشنر دہلی سے شکایت کی کہ حسن نظامی نے ہمیں "اصحاب فیل" لکھا ہے اور ہماری توہین کی ہے۔ مجھ سے اور واحدی صاحب سے میجر ہیڈن نے جواب طلب کیا۔ میں نے جواب دیا۔ علماء و مشائخ ہاتھیوں پر بیٹھنا بُرا سمجھتے تھے تو ہاتھیوں پر بیٹھے کیوں۔ میں نے تو انگریزوں کی تعریف کی ہے کہ علماء و مشائخ کو ہاتھی نشین کر دیا اور اُن کی عزت بڑھائی۔ اصحاب فیل اور ہاتھی نشین کہنے سے علماء و مشائخ کی توہین کیسے ہو سکتی ہے۔

میجر ہیڈن، اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ کے اصحاب فیل سے واقف نہ تھے اُنھوں نے کہا "بے شک مولوی لوگ کی غلطی ہے۔ اچھا یہ بتائیے آپ دربار میں کیوں نہیں آئے؟" میں نے کہا۔ رات کے چار بجے سے لوگ دربار کی شرکت کے لئے گئے تھے، میں اُس وقت گرم لحاف اوڑھے پڑا تھا۔ مجھے دربار سے لحاف اچھا معلوم ہوا۔ میجر ہیڈن ہنسے اور ہم دونوں گھر آ گئے۔

میں نے یہ سارا ماجرا حضرت اکبر کو لکھ کر بھیج دیا۔ حضرت اکبر نے ہمت اور حوصلہ بڑھانے والا جواب لکھا کہ جیسا جواب یونان کے حکیم دیوجانس کلبی نے سکندر کو دیا تھا، ویسا جواب آپ نے ڈپٹی کمشنر دہلی کو دیا۔

اس کے بعد حضرت اکبر کے چھوٹے بیٹے سید ہاشم مرحوم دہلی آئے اور میرے پاس واحدی صاحب کے ہاں ٹھیرے۔ میں اُن دنوں جو کی روٹی کھایا کرتا تھا۔ ہاشم مرحوم کو یہ بات عجیب سی لگی

اُنھوں نے الہ آباد جاکر کہا کہ دسترخوان پر اچھے اچھے کھانے ہوتے تھے، مگر خواجہ صاحب جَو کی روٹی کھاتے تھے۔ حضرت اکبر نے مجھے لکھا کہ ہاشم پر آپ کی زندگی کا بے حد اثر ہے اور ہاشم کے باپ نے بھی اپنے دل میں آپ کے لئے جگہ بنالی ہے۔"

خواجہ صاحب کے جواب تو دلچسپ اور پسند کرنے کے لائق تھے ہی، خواجہ صاحب کا سلام کرنے نہ جانا اور دربار میں شریک نہ ہونا بھی حضرت اکبر کی طبیعت کے مطابق تھا۔ حضرت اکبر اس قسم کے "اعزاز" سے گھبراتے تھے۔ ایک دفعہ نواب وقار الملک، سکریٹری مدرستہ العلوم علی گڑھ نے اسلامی کانفرنس کا صدر بنانا چاہا۔ حضرت اکبر نے انکار کردیا اور لکھا ؎

وزن نا محدود میزانِ نظر میں خوب ہے

نام کی خاطر ترش کر تولہ ماشہ کیوں بنو

دینِ حق ہے آنکھ زینت ہے تماشائے جہاں

تم تماشائی رہو، اکبرؔ تماشہ کیوں بنو

حضرت اکبرؔ کا اپنا ایک مصرع حضرت اکبر کے بالکل حسبِ حال ہے ؎

بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

جَو کی روٹی کھانے پر وہ قصہ یاد آگیا جس نے خواجہ صاحب اور حضرت اکبر کے تعلقات کو استوار کیا تھا۔ ابتدائے ملاقات کا قصہ ہے۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۱۰ء کو والدہ عشرت حسین کا انتقال ہوا۔ حضرت اکبر بیوی کو سپردِ خاک کرکے لوٹے تھے کہ یکایک خواجہ صاحب دلّی سے الہ آباد پہنچے۔ خواجہ صاحب حضرت اکبرؔ کے ہاں ٹھیرا کرتے تھے۔ اُس دن بھی حسب دستور حضرت اکبر کے ہاں آئے۔ اُنھیں والدہ عشرت حسین کے انتقال کی خبر نہیں تھی۔ حضرت اکبر نے خواجہ صاحب کو

دیکھ کر فرمایا:-

"چلے آتے ہیں۔ چلے آتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ مجھ پر کیا بیت گئی۔ جائیے۔ جائیے۔ میرے ہاں آپ کا ٹھکانہ نہیں ہے۔ آپ کے کھانے اور ٹھہرنے کا جو انتظام کیا کرتی تھیں، انھیں میں ابھی دفن کر کے آیا ہوں"

حضرت اکبر کے یہ الفاظ خواجہ صاحب کے ایک نوٹ سے نقل کئے گئے ہیں ان الفاظ کو لکھ کر خواجہ صاحب فرماتے ہیں:-

"حضرت اکبر کے گرد مجمع تھا۔ میں نے اس برتاؤ سے تکلیف محسوس کی مگر اپنے تئیں سنبھالا اور جرأت کر کے کہا۔ مجھے اللہ نے بھیجا ہے۔ تاکہ غم اور مصیبت میں آپ کو تسلی دوں۔ حضرت اکبر تیوری چڑھا کر بولے ۔ اللہ نے بھیجتے وقت اتنا نہ سوچا کہ اکبر کھانے اور ٹھہرانے کا انتظام نہیں کر سکتا۔ میں نے عرض کیا۔ اللہ نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ جہاں جوتیاں اُتاری جاتی ہیں۔ وہاں بستر بچھا لینا اور بازار سے دو پیسے کی روٹی اور ایک پیسے کے کباب خرید کر پیٹ بھر لینا اکبر پر بوجھ نہ ڈالنا۔

حضرت اکبر عینک دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر تھوڑی دیر مجھے گھورتے رہے۔ پھر کالے خاں (ملازم) کو آواز دی اور کہا جاؤ۔ دو پیسے کی روٹی اور ایک پیسے کے کباب لے آؤ۔

کالے خاں کباب روٹی لے آیا اور میں نے مجمع کے سامنے کباب روٹی کھالی۔ حضرت اکبر نے فرمایا۔ خواجہ صاحب! میری، آپ کی نبھ جائے گی۔ آپ نے کباب روٹی اُسی رغبت سے کھائی ہے

جس رغبت سے مکلف کھانے کھاتے ہیں :"

خواجہ صاحب کی بڑی لڑکی حور بانو سے حضرت اکبر بہت مانوس تھے۔ خواجہ صاحب کو الہ آباد بلاتے تو تاکید کرتے کہ حور بانو کو ساتھ لائیے گا۔ حضرت اکبر کی بہن والدہ سید حمایت حسین حور بانو کو نہلاتیں، زیور پہناتیں اور حضرت اکبر کو دکھاتیں حضرت اکبر خوش ہوتے۔ حور بانو اُس وقت آٹھ نو برس کی تھیں۔ حضرت اکبر کا خیال تھا کہ ہاشم کو حور بانو سے بیاہیں گے۔ لیکن یہ خیال ظاہر نہیں کیا تھا کہ ہاشم اللہ کے ہاں سدھار گئے۔ جب خواجہ صاحب تعزیت کرنے الہ آباد گئے تو حضرت اکبر نے رو کر فرمایا کہ حور بانو بیوہ ہوگئی۔ پھر صفائی سے کہا :۔

"خواجہ صاحب! جو تعلق میرے دل کو آپ سے ہے اُسے ہمیشہ قائم رکھنے کے لئے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہاشم کی شادی حور بانو سے کروں گا۔ مگر اللہ کو منظور نہ تھا"

حضرت اکبر خواجہ صاحب کے ہاں یہ ارادہ کر کے تشریف لائے کہ اب سلطان المشائخ کے قدموں میں رہوں گا اور یہیں دم دوں گا۔ ہر وقت حور بانو کو پاس بٹھائے رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ :۔

"حور بانو سے مجھے تسکین ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہاشم زندہ ہے"

اتفاق کی بات حضرت اکبر کی تشریف آوری کے مہینہ سوا مہینے بعد حور بانو کا ایک جگہ رشتہ طے پا گیا اور شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ حضرت اکبر نے فرمایا۔ میں حور بانو کی شادی میں شرکت کرتا۔ لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ الہ آباد جانے کی اجازت دیجیے اور الہ آباد چلے گئے۔ الہ آباد سے حور بانو کے جہیز کے لئے نظم لکھ کر بھیجی نظم جہیز میں دیدی گئی تھی۔ حور بانو کے انتقال کے بعد اُن کے شوہر سے خواجہ صاحب کے فرزند خواجہ حسن ثانی نظامی نے نظم مانگی تھی۔ معلوم ہوا کہ محفوظ نہیں رہی۔ مل جاتی تو میں

بتلاتا کہ وہ کون سی نظم ہے اور کلیاتِ اکبر میں نہ چھپی ہوتی تو یہاں چھاپ دیتا۔

ہاشم کی موت نے حضرت اکبر کی دنیا کو ختم کر دیا تھا۔ ستر کے لگ بھگ عمر۔ انحطاط کا دَور اور بیوی اور بیٹے کا داغ۔ اقبال تھا تو ایسا کہ آج منصف ہیں تو کل سب جج اور سشن جج ـــــ ہائی کورٹ کی ججی پیش کی گئی تو حضرت اکبر نے اُسے قبول نہیں کیا۔ روپے کی جگہ روپیہ تھا، عہدوں کی جگہ عہدے۔ عزت کی جگہ عزت اور شہرت کی جگہ شہرت۔ لیکن ہاشم کے انتقال کے بعد کیسا اقبال اور کیسا زوال، حضرت اکبر حال سے بے حال تھے۔ سید عشرت حسین پرتاب گڑھ میں تھے، وہاں لوگوں نے مشاعرہ کیا اور عشرت صاحب سے کہا کہ حضرت اکبر کی غزل منگائیے۔ حضرت اکبر نے بس ایک شعر لکھ بھیجا ؎

اَب تک ہے اُنھیں زینتِ سابق کا تصوّر
یاروں نے مرا خانۂ ویراں نہیں دیکھا

زندگی سے بے زار تھے۔ ۱۹۱۸-۱۹ء میں عالمگیر وبائی انفلوئنزا پھیلا حضرت اکبر بھی اس میں مبتلا ہوئے۔ لیکن بچ گئے۔ شعر کہا ؎

کمزور ہے میری صحت بھی کمزور مری بیماری بھی
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

موت کا تو وقت معین ہوتا ہے۔ آخر ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو وہ وقت آگیا خواجہ صاحب حضرت اکبر کی رحلت کے دن الٰہ آباد میں موجود تھے۔ حضرت اکبر کی رحلت کا حال اُن ہی کی زبانی سُنیے :۔

"جمعہ کے دن، گیارہ بجے، میں الٰہ آباد پہنچا، حضرت اکبر کے فرزند عشرت حسین کے سوا کوئی اور اقربا و احباب میں سے موجود نہ تھا حضرت اکبر گاؤ تکیے کے سہارے لیٹے تھے۔ آنکھیں نیم باز تھیں پتلیاں

اوپر کو چڑھ چکی تھیں، ناک کا بانسہ ڈھل گیا تھا۔ آخری پسینہ آرہا تھا۔ پاؤں سمٹے ہوئے تھے۔

میں قریب جاکر بیٹھا تو عشرت میاں نے کہا۔ خواجہ صاحب دلی سے آئے ہیں۔ کچھ جواب نہیں دیا۔ میں نے ہاتھوں کو پکڑ کر چوما اور آنکھوں سے لگایا جب بھی انھیں خبر نہ ہوئی۔ پھر میں نے بلند آواز سے حزب البحر شروع کردی۔ جب یہ فقرے پڑھے :۔

نِعْمَ الرَّبُّ رَبِّی وَنِعْمَ الْحَسْبُ حَسْبِی۔

یعنی اچھا رب میرا رب ہے اور اچھا ٹھکانہ میرا ٹھکانہ ہے

عَیْنُ اللّٰہِ نَاظِرَۃٌ اِلَیْنَا۔ اللہ کی آنکھ ہماری طرف دیکھ رہی ہے

ان فقروں پر ہاتھ سے اشارہ سا کیا۔ میں نے فقروں کی تکرار کی۔

حزب البحر کے بعد کلمہ پڑھنے لگا اور جب میں نے کہا لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ تو حضرت اکبر کے ہاتھوں میں رعشے کی سی جنبش ہوئی اور میں نے دیکھا کہ ہونٹوں میں بھی جنبش ہے۔

رفتہ رفتہ سانس ہلکا ہونے لگا اور تین بجنے میں تین منٹ باقی تھے کہ سانس رک گیا اور زندگی پوری ہوگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن "

حضرت اکبر نے اپنے مکان کا نام بیٹے کے نام پر "عشرت منزل" رکھا تھا اور حضرت اکبر فرمایا کرتے تھے کہ عشرت حسین اگر مفلوک الحال ہوجائیں تو صرف شین کے تین نقطے اڑانے پڑیں گے اور عسرت منزل نام لیا جاسکیگا۔ یا عشرت حسین مر جائیں تو شین کو بے سے بدل کر عبرت منزل پڑھ لیا جائے۔

حضرت اکبر کا یہ فرمانا، میں نے "حیات اکبر" میں لکھا اور خواجہ صاحب نے

اسے پڑھا تو مجھے تحریر فرمایا کہ :-

"عشرت منزل۔ عسرت منزل اور عبرت منزل کا ذکر بڑا دلخراش ہے۔ میں نے پڑھا تو روتے روتے بے حال ہو گیا۔ میں نے عشرت منزل کی گہما گہمی بھی دیکھی ہے اور اب اس کا عسرت منزل اور عبرت منزل ہونا بھی دیکھ رہا ہوں۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"

خواجہ صاحب اور حضرتِ اکبر کی ملاقات سنہ ۱۹۱۰ء سے تھی۔ خط و کتابت شاید اُس سے پہلے سے ہو۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں حضرتِ اکبر دلی آئے اور حکیم اجمل خاں نے انھیں اوکھلا میں پرچا پارٹی دی۔ وہاں خواجہ صاحب نے حضرت اکبر کو اور حضرت اکبر نے خواجہ صاحب کو اول مرتبہ دیکھا اور اسی روز سے دونوں ایک دوسرے کے مخلص بن گئے دونوں کا تعلق کامل اخلاص کے ساتھ سنہ ۱۹۲۱ء یعنی حضرتِ اکبر کی وفات تک رہا اور خواجہ صاحب نے اُسے حضرتِ اکبر کے خاندان سے آخر دم تک نباہا۔

حضرتِ اکبر نے سنہ ۱۹۱۰ء اور سنہ ۱۹۲۱ء کے درمیان نظام المشائخ سے زیادہ کسی رسالے کے لئے نہیں لکھا۔ "ایڈیٹر نظام المشائخ کی فرمائش پر" کلیاتِ اکبر کا ایک مستقل عنوان ہے۔ خواجہ صاحب کے متعلق بھی اس قسم کے اشعار کہے ؎

حسن نظامی کو میں نے دیکھا، شریف خصلت فقیر صورت

عمل ہے اپنے ہی عنصروں میں، اگرچہ دلی کی ہے ذہانت

رہے خواجہ صاحب، تو خواجہ صاحب نے تو حضرت اکبر کے کمرے میں جلنے والی موم بتی کو بھی بجھتے بجھتے ایسا روشن کر دیا کہ وہ داغ فراق صحبت شب کی ہمیشہ یاد دلائے گی۔

خواجہ صاحب کا برتاؤ اپنے غریب ملنے والوں کیساتھ

خواجہ صاحب کی عادت تھی کہ ایک جگہ بیٹھ کر کام نہیں کرتے تھے۔ سال ڈیڑھ سال کے اندر نشست ضرور بدل دیتے تھے۔ بعض اوقات دفتر کا کچھ حصہ دوسرے مکان میں منتقل ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات بستی حضرت نظام الدین سے میرے مکان میں دلی آجاتا تھا۔ دو دفعہ جامع مسجد کے زیر سایہ کرائے کا مکان لے کر وہاں بھی دفتر رکھا۔

جامع مسجد کے قرب کا دور تھا۔ منشی قربان علی بسمل جو جامع مسجد کے قریب رہتے تھے۔ خواجہ صاحب سے کہا مجھے کسی کام پر لگا لیجئے، خواجہ صاحب نے محررری پر لگا لیا۔

بسمل صاحب خواجہ صاحب سے سوائی عمر کے آدمی تھے اور خواجہ صاحب کے والد کے پاس اٹھ بیٹھ چکے تھے۔ ملازمت سے قبل وہ آتے تھے تو خواجہ صاحب تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ ملازمت کے بعد بھی خواجہ صاحب نے اس وضع کو نہیں چھوڑا بسمل صاحب خواجہ صاحب کے کمرے کا پھیرا کرتے تو خواجہ صاحب اب بھی کھڑے ہوتے تھے۔

حسب معمول دفتر پھر بستی حضرت نظام الدین پہنچ گیا لیکن بسمل صاحب کی امداد خواجہ صاحب نے بند نہیں کی، انھیں دکان کھلوا دی بسمل صاحب مرتے دم تک خواجہ صاحب کی کتابیں بیچتے رہے اور کتابوں وغیرہ کی چھپائی کی نگرانی کرتے رہے۔

خواجہ صاحب کام چوروں کی مدد نہیں کرتے تھے

خواجہ صاحب معذوروں، اپاہجوں اور مستحقوں کی جی کھول کر مدد فرماتے تھے۔ نادار بیماروں کا علاج اور طالب علموں کی پڑھائی کا خرچ خوشی سے اپنے ذمے لے لیتے تھے مگر مسٹنڈے بھکاریوں کو بھیک کبھی نہیں دیتے تھے۔ کوئی بھیک مانگنے آتا تو اس سے

کہتے۔ محنت کروگے؟ وہ دھنی ہوجاتا تو بے ضرورت اس اوکھلی کے دھان اُس اوکھلی میں پلٹوائے جاتے اور محنت سے زیادہ محنت کا معاوضہ دیئے جاتے، ایسے مزدور اُن کے ہاں روزانہ ہی ہوتے تھے کہ خواہ مخواہ الماریوں میں سے کتابیں نکال رہے ہیں اور دوبارہ بھر رہے ہیں، خواہ مخواہ دیواریں ڈھا رہے ہیں، اور دوبارہ چن رہے ہیں بستی حضرت نظام الدین کے مزدور خواجہ صاحب کے زمانے میں بھوکے نہیں سوتے تھے۔

خواجہ صاحب کی خوش باشی

یہ بات بتا چکا ہوں کہ حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی خواجہ صاحب کے پیر تھے پیر صاحبؒ کے مریدوں سے خواجہ صاحب کو خاص لگاؤ تھا۔ ۲۲-۱۹۲۱ء میں ایک صاحب خان نعمت اللہ خاں، دپٹی ڈسٹرکٹ جیل کے جیلر ہوکر تشریف لائے۔ وہ بھی پیر صاحب کے مرید اور خواجہ صاحب کے پیر بھائی تھے، خواجہ صاحب کی اور ان کی گہری چھننے لگی۔ ۱۹۲۳ء میں خان نعمت اللہ خاں اجمیر شریف گئے جس وقت درگاہ کے اندر قدم رکھا تو داڑھی کسی قدر بڑھی ہوئی تھی۔ مونڈنی بھول گئے تھے۔ خاں صاحب نے فیصلہ کیا کہ اب یہ بال متبرک ہو گئے۔ انھیں نہیں مونڈوں گا۔ چنانچہ داڑھی بڑھتی رہی اور ۱۹۲۴ء میں یکمشت دو دو انگشت سے آگے نکل گئی۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ خاں صاحب! میں آپ کی داڑھی کی سالگرہ کروں گا۔

خان نعمت اللہ خاں کی داڑھی کی سالگرہ

خواجہ صاحب نے اس تقریب کا بڑا دلچسپ رقعہ[1] لکھا اور جیل کے دروازہ

---

[1] یہ رقعہ افسوس ہے محفوظ نہیں رہا۔

کے سامنے بغلی میدان میں ہندو مسلمان عمائد اور شعرار کو جمع فرمایا۔ کونسل آف اسٹیٹ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ تیرہ چودہ ممبران کونسل نے شرکت کی، قوالی کی مجلس جمی علی بخش واعظ قوال نے کبیر کے کلام سے مجلس کو گرمایا۔ ڈاڑھی کی موافقت اور مخالفت میں مضامین پڑھے گئے۔ شیخ محمد یعقوب کے اہتمام سے مکلّف کھانے پکے۔ مسٹر آصف علی مقید تھے۔ انھیں باہر تو نہیں لایا جا سکتا تھا، کھانا بھیجا گیا۔

ایسا انوکھا اجتماع کرنا خواجہ صاحب ہی کا حصہ تھا۔ جو بات کرتے تھے لاجواب کرتے تھے۔ اس نوعیت کا جلسہ چشم فلک نے بھلا اور کب دیکھا ہوگا۔

عام طور پر خواجہ صاحب تفریحات سے واسطہ نہیں رکھتے تھے۔ انکی تفریح صرف کام میں تھی۔ کام کو بار نہیں بناتے تھے۔ کام کو رغبت سے کرتے تھے اور کام میں یا کام کے سلسلے میں انھیں بہتیری تفریح ہو جاتی تھی۔ تاہم جب تفریح کی کی سوجھتی تھی تو ایسی سوجھتی تھی۔ یہ انسداد ارتداد کا زمانہ تھا۔ اس کی مصروفیت العظمۃ للہ۔ لیکن اسی مصروفیت میں یہ عجیب و غریب تفریح سوجھ گئی۔

انسداد ارتداد

انسداد ارتداد کا نام آگیا ہے تو کیوں نہ یہ قصہ بھی چکا دوں۔

ہندو مسلم اتحاد زوروں پر تھا۔ گاندھی جی نے ہندوؤں کو مسلمانوں سے اور مولانا محمد علی نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے اتنا قریب کر دیا تھا کہ دونوں یک جان و دو قالب نظر آتے تھے۔ انگریزی حکومت اس اتحاد سے پریشان تھی۔ مگر اس کا دماغ پریشان نہیں تھا۔

سوامی شردھانند ایک ممتاز آریہ لیڈر کانگریس میں شامل ہوئے اور کانگریس کی خاطر جیل خانے گئے۔ لیکن جیل خانے سے پلٹے تو یہ خیال لے کر پلٹے کہ مسلمان ہمیشہ

الگ حقوق کا سوال چھیڑا کرتے ہیں، مسلمانوں کو آریہ بنا لینا چاہیے تاکہ الگ حقوق کی بحث ختم ہو جائے۔

اسلام سے واقف شہری مسلمان تو کیا قابو میں آ سکتے تھے۔ سوامی جی نے دیہاتی مسلمانوں میں "شدھی" کا کام شروع کر دیا، یعنی "پاک" بنانے کا کام۔ اُن کے نزدیک مسلمان رہنا ناپاکی کی بات تھی اور آریہ ہو جانا پاک ہو جانا تھا۔

مسلمانوں کی زبان میں اسلام سے پھرنے کو ارتداد کہتے ہیں۔ ارتداد کے انسداد اور ارتداد کی روک تھام کے لیے مسلمانوں کی بہت سی جماعتیں کھڑی ہو گئیں اور خواجہ صاحب نے انسداد ارتداد کا یکہ و تنہا بیڑا اٹھایا۔

کسی گاڑی میں دو یا دو سے زیادہ گھوڑے جتے ہوئے ہوں اور ایک ان میں چست ہو اور باقی سست تو سست گھوڑے چست کو بھی چلنے نہیں دیتے دوسرے ریزولیوشن پاس کرتے رہتے تھے اور خواجہ صاحب کہیں سے کہیں پہنچ جاتے تھے خواجہ صاحب نے انسداد کی گاڑی تنہا ایسی مستعدی اور ایسی ہوشیاری سے چلائی کہ "شدھی" کی گاڑی اُس سے ہار مان گئی۔ خواجہ صاحب کے مقابلہ میں سوامی شردھانند ایک جگہ بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔

خواجہ صاحب فقط مدافعت اور بچاؤ کا فرض انجام دیتے تھے، خود حملہ نہیں کرتے تھے۔ مسلمانوں کو سمجھاتے تھے کہ اسلام مت چھوڑو۔ آریوں سے نہیں اُلجھتے تھے۔ مسلمانوں کے سمجھانے کے لئے خواجہ صاحب نے کروڑوں کی تعداد میں ہینڈبل۔ پوسٹر اور پمفلٹ شائع کئے۔

خواجہ صاحب نفسیات کے عالم نہیں تھے، لیکن نفسیات کے فطرتاً ماہر تھے۔ چٹکلوں میں دیہاتی مسلمانوں کا رُخ اِدھر سے اُدھر پھیر دیتے تھے۔

شاید ضلع متھرا کے اطراف کا واقعہ ہے۔ علما کرام ملکانہ راجپوتوں کو حقانیت اسلام کے دلائل دیتے دیتے تھک گئے تو خواجہ صاحب نے انسے ایک فقرہ کہا:

کہ مجھے بتاؤ جس دین کی نشانی پکی ہو وہ سچا ہے یا جس دین کی نشانی کچی ہو وہ سچا ہے۔ یہ دیہاتی مسلمان بولے۔ جی۔ سچا تو وہ جس کی نشانی پکی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا۔ تو ہندو مت کی نشانی چوٹی ہے اور اسلام کی نشانی ختنہ۔ چوٹی ہر آن کٹ سکتی ہے، ختنہ مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ دیہاتی اس دلیل کو فوراً مان گئے۔

کاٹھیاواڑ میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی، جس کا نام وزیریہ تھا۔ والیٔ ریاست نومسلم راجپوت تھے، جو ٹھاکر صاحب کہلاتے تھے۔ وہ اور اُن کے پانچ چھ لاکھ ہم قوم آریہ ہونے پر تل گئے۔ خواجہ صاحب نے ٹھاکر صاحب سے فرمایا کہ ہمارے علاقے کے مسلم راجپوتوں نے تو آریوں کو یہ جواب دیا تھا کہ "مسلمانوں کی تلوار سے بنیے نہیں ڈرے۔ چمار چوہڑے نہیں ڈرے۔ مگر بہادر راجپوت ڈر گئے اور تلوار کے ڈر سے مسلمان ہو گئے۔ یہ ہمارے باپ دادا کی توہین ہے، ہم بہادر ہیں اور ہم نے بہادروں کا دین قبول کیا ہے"۔

گاندھی جی اور ہندو کانگریسی لیڈروں نے سوامی شردھانند کو بھی قطعی سمجھایا ہوگا کہ آپ کی تحریک "شدھی" ہمارے کئے دھرے پر پانی پھیرے دیتی ہے۔ لیکن سوامی جی کے سمجھائے جانے کا مجھے علم نہیں ہے، قیاس سے کہہ رہا ہوں۔ البتہ گاندھی جی اور مسلمان کانگریسی لیڈروں نے خواجہ صاحب کو جب جب سمجھایا وہ میرے علم میں ہے۔

خواجہ صاحب کا ہر دفعہ ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ میں نے حملہ نہیں کیا، میں مدافعت کر رہا ہوں۔ کیا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ سوامی شردھانند مسلمانوں کو آریہ بنائے چلے جائیں اور میں ٹک ٹک بیٹھا دیکھا کروں۔ آپ لوگ سوامی شردھانند سے کہیے کہ خیال خام سے باز آئیں، اُن کے باز آنے کے بعد میرا کام خود بخود ہو جائے گا۔

بٹالے کا نوٹس

آریوں نے خواجہ صاحب کو طرح طرح سے دق کرنے کی ٹھان لی۔ آریہ اخباروں اور آریہ لیڈروں نے انھیں ہندو قوم کا اور ملک کا دشمن قرار دے دیا۔ ایک صاحب کا بٹالہ ضلع گورداسپور سے نوٹس آیا کہ آپ خواجہ پریس بٹالے کے لئے اتنا کاغذ خرید کر خاموش ہیں، اُس کی قیمت فلاں تاریخ تک ادا کیجئے، ورنہ عدالت کے ذریعہ وصول کیا جائے گا۔

بٹالہ کے پریس کا نام چونکہ خواجہ پریس تھا، اُن صاحب نے خواجہ کے لفظ سے دق کرنے کا راستہ نکال لیا۔ خواجہ صاحب بٹالہ جاکر پریس کیا کرتے، دلی کے خواجہ پریس کے بھی خواجہ صاحب مالک نہیں تھے۔ خواجہ صاحب نے انھیں جواب بھیجدیا کہ اب تک تین پرچے تو ضرور جاری کئے ہیں۔ ماہوار نظام المشائخ۔ ماہوار مرشد اور روزنامہ رعیت۔ باقی پریس کبھی کوئی قائم نہیں کیا۔

سانپ کے بچے کا خطاب

جموں (کشمیر) میں خواجہ صاحب کی زیرِ صدارت مشاعرہ ہونے والا تھا آریوں نے اشتہار چسپاں کیا کہ "سانپ کے بچوں کی امداد کے لئے اُس جلسے میں ہندو نہ جائیں، جس کی صدارت حسن نظامی کرے گا"۔ لیکن ہندوؤں نے اس اشتہار کی مطلق پرواہ نہیں کی۔ مشاعرہ میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو آئے۔ غزلیں پڑھنے والوں میں بھی ہندوؤں کی اکثریت تھی اور ہندوؤں کی غزلوں میں تصوف کا رنگ غالب تھا۔

سناتنی ہندوؤں کو خواجہ صاحب سے پرخاش کیوں ہوتی۔ اُن کے نزدیک

آریوں کا عمل ناجائز تھا کہ وہ انھیں ہندو بنانا چاہتے تھے جنھوں نے ہندوؤں میں جنم نہیں لیا تھا۔ سناتن دھرم تبلیغی مذہب نہیں ہے۔ یہ صرف اُس کا حق ہے جو ہندوؤں میں جنم لے۔

جموں ہی نہیں، کہیں بھی سناتنی ہندوؤں سے خواجہ صاحب کے تعلقات نہیں بگڑے۔ خواجہ صاحب کے ساتھ جن سناتنی ہندوؤں کو عقیدت تھی اُسے "شدھی" کی تحریک کے بعد ایک ہندو نے ترک نہیں کیا، بلکہ سناتنی مذہبی پیشواؤں سے تو "شدھی" کی تحریک کے بعد خواجہ صاحب کے تعلقات اور مراسم اور بڑھے۔ اُن پیشواؤں کا تذکرہ آگے آئے گا۔ البتہ دو چار سناتنی سیاسی لیڈر ایسے تھے جو سوامی شردھانند کے ہم نوا تھے۔ دراصل "شدھی" کی تحریک مذہبی تحریک نہیں تھی، سیاسی تحریک تھی اور سیاسی بھی کیا کہوں! دس کروڑ مسلمان ہندو ہونے سے رہے تھے، محض چھیڑنا اور اتحاد کو توڑنا مقصود تھا۔ اس چھیڑ خوانی سے کچھ ہندو لیڈروں کا ضرور بھلا ہوا۔ لیکن ہندو قوم کا ہرگز بھلا نہیں ہوا۔

یہ عجیب زمانہ تھا۔ آخر میں تو سب ہی بڑے ہندوؤں اور بڑے مسلمانوں کے سامنے اپنی ذات رہ گئی تھی۔ سب اپنی اپنی قوموں میں ہردلعزیزی اور سرخروئی حاصل کرنے کے لئے ملک کا مستقبل خراب کئے ڈالتے تھے۔ مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی تک میں تفرقہ پڑ گیا۔ مولانا محمد علی نے رحلت سے تین دن پہلے یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو وزیر اعظم برطانیہ کے نام جو تاریخی خط لکھا تھا اُس کے مندرجہ ذیل فقرے پڑھئے:۔

"مجھے اس واقعہ نے کافی بددل کر دیا ہے کہ گول میز کانفرنس کو ہندوستانی فرقہ آرائی کا دھوبی تلاؤ بنا لیا گیا۔ یہ سوال تو درحقیقت ہندوستان میں طے ہو جانا چاہیے تھا۔

ہم نے دس برس تک ہر قسم کے گرم و سرد میں گاندھی جی کے ساتھ کام

کیا اور یہ چیز بار بار ہمنے اُنکے سامنے پیش کی، لیکن اُن کے ہندوؤں میں اپنی اور پنڈت موتی لال نہرو کی ہردلعزیزی قائم رکھنے کے خیال نے کبھی سمجھوتہ نہ ہونے دیا۔ ۱۹۲۸ء میں باوجود ہماری پُرزور درخواست کے کانگریس نے ہندو مسلم سمجھوتہ نہ کرایا۔"

خیر میں کہہ رہا تھا کہ "شدھی" کی تحریک کے بعد سناتنی مذہبی پیشواؤں سے خواجہ صاحب کے تعلقات خراب نہیں ہوئے۔ خواجہ صاحب کے کام میں تعلقات بگڑنے کی بات کونسی تھی۔ سوامی شردھانند نے مسلمانوں کو آریہ بنانے کا بیڑہ اُٹھایا خواجہ صاحب اور خواجہ صاحب کی طرح بہت سے مسلمان سوامی جی کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے۔ ارتداد سے بچانے پر کوئی معقول ہندو کیا اعتراض کرسکتا ہے اور بچانے والوں سے کیسے بگڑ سکتا ہے۔

خواجہ صاحب مسلمانوں کو نامعقولیت نہیں سکھاتے تھے۔ ابھی ہم اور آپ خواجہ صاحب کے ساتھ جموں ہی میں ہیں۔ جموں کی ایک مثال لیجیے۔ خواجہ صاحب نے سفر جموں کا حال لکھا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"آج صبح ایک مسلمان آیا اور کہنے لگا کہ فلاں انگریز فوجی افسر نے مسجد شہید کردی اور اُن بیس مسلمانوں کو جیل بھیج دیا جنھوں نے اُس کے خلاف عرضیاں دی تھیں۔

میں نے اس واقعہ کی اطلاع متعلقہ ہندو افسر کو دی اور پھر اُس سے خود ملا۔ بعد میں کرنل سیّد غلام علی صاحب سے معلوم ہوا کہ واقعات کو مبالغہ کا رنگ دیا گیا ہے۔ ایک چبوترہ جس پر فوجی سپاہی بیٹھکر باجہ بجاتے تھے گرادیا گیا ہے۔ اُس چبوترہ پر وہی سپاہی کھانے کا وقت آتا تھا تو کھانا بھی کھالیتے تھے اور نماز کا وقت آتا تھا تو نماز بھی

پڑھ لیتے تھے، مگر وہ چبوترہ نماز کے لئے مخصوص نہ تھا۔
کرنل صاحب کی گواہی نے مجھے مطمئن کر دیا۔ مسلمانوں کو عاقبت اندیشی اختیار کرنی چاہیئے۔ غلط بیانی اور مبالغہ اچھی بات نہیں ہے۔"

جسے چیونٹیوں کی غلطیاں محسوس ہوتی ہوں اور جسے چیونٹیوں کی غلطیاں متاثر کرتی ہوں، وہ انسانوں اور خصوصاً مسلمانوں کی غلطیاں کیوں نہ محسوس کرتا ہوگا اور اُسے اِن کی غلطیاں متاثر کیوں نہ کرتی ہونگی اور وہ اُنھیں نامعقولیت کیوں سکھانے لگا تھا۔ انسداد ارتداد کے دَور کی ایک تحریر ملاحظہ کیجئے ۱۷ جولائی ۱۹۲۴ء کے روزنامچہ میں لکھتے ہیں:۔

"زیارت مزار حضرت محبوب الٰہیؒ اور نماز سے فارغ ہو کر بڑے لڑکے حسین راضی بہ امر اللہ کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے گیا۔ قبرستان کے باغ میں بہار تھی حوض اُبل رہے تھے، پانی نالی نالی لہراتا ہوا چمن بندیوں میں جا رہا تھا۔ مور دوڑتے پھرتے تھے۔ ایک جگہ نالی کا پانی اُبل کر باہر نکل آیا۔ وہاں کچھ چیونٹیاں پانی میں گھر گئیں۔ چاروں طرف پانی تھا جو چھوٹے جانوروں کو غرق کرنے کے لئے بہا اور اُمڈا چلا آتا تھا حسن نظامی کے دل نے کہا۔ ان کی جان کیونکر بچے۔ ان کے لئے تو یہ تھوڑا سا پانی بھی سیلاب اور طوفان ہے۔ حسین نے رائے دی کہ اپنی لکڑی پانی کے بیچ میں کھڑی کر دیجئے تاکہ چیونٹیاں اُس پر چڑھ جائیں حسن نظامی نے حسین کی تجویز پر عمل کیا مگر چیونٹیوں نے امداد قبول نہیں کی اور لکڑی پر نہیں چڑھیں اور پانی میں ڈوب گئیں۔

"میں سوچنے لگا کہ جان بچانے کی عقل تو اللہ نے جانوروں کو بھی دی ہے، پھر ان چیونٹیوں نے اس پناہ سے فائدہ کیوں نہ اُٹھایا۔ شاید انسان کی خود غرضی

سے اُنھوں نے خوف کھایا ہو کہ پناہ دیگر کوئی مطلب نہ نکالے۔ یا تو آدمی جانوروں میں بدنام ہے یا ان چیونٹیوں کو بچاؤ کا شعور نہیں ہے اور یا انھیں مرنے کی پرواہ نہیں ہے۔"

خواجہ صاحب اِن احساسات اور ان جذبات کے انسان تھے لیکن اُن کے ساتھ آریہ کیا برتاؤ کر رہے تھے۔ ۱۱ رجولائی سنہ ۱۹۲۴ء کے روزنامچے کے بعد ۱۲ رجولائی سنہ ۱۹۲۴ء کے روزنامچے کا اقتباس بھی پڑھ لیجیے:۔

"کل دِلّی میں ہندو مسلم فساد ہو گیا تھا۔ آج دوپہر سے ٹیلیفون آنے شروع ہوئے کہ ہم تمھیں قتل کریں گے۔ رات تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۳۲۱ نمبر کے ٹیلیفون پر ایک صاحب نے کہا "فساد کا باعث تم ہو، تم یہاں آؤ اور فساد کو روکو۔" میں نے جواب دیا۔ آپ کا خیال صحیح نہیں ہے۔ مگر میں دلی آنے کو تیار ہوں۔ اپنا پتہ بتائیے۔ ابھی آجاتا ہوں۔ وہ خوفزدہ ہو کر بولے۔ اس وقت آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل دیکھا جائے گا۔ انھوں نے نام اور پتہ نہیں بتایا۔ لیکن ٹیلیفون کا نمبر ۱۳۲۱ میں نے اکسچنج سے معلوم کر لیا۔
پھر کسی اور ٹیلیفون پر کوئی اور چیخا "ہم تمھیں گرفتار کرائیں۔ اور جو ہندو مارے گئے ہیں، اُن کے عوض تمھیں پھانسی دلوائیں گے۔ میں نے ہنس کر ٹیلیفون بند کر دیا۔
تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ دوسری آواز کے کسی شخص نے کہا۔ تیار رہو آج رات ہم تمھیں قتل کرنے آئیں گے۔ میں نے جواب دیا۔ دس سے پہلے تشریف لائیے گا۔ دس بجے میں سو جاتا ہوں۔ رات کو میرا قیام اُس مکان میں ہوتا ہے جس کا نام ایمان خانہ ہے، میں اکیلا

ہوتا ہوں۔ بے فکری سے آیئے۔"

۱۳ر جولائی ۱۹۲۴ء کو لکھتے ہیں:۔

"ٹیلیفون برابر آ رہے ہیں۔ گالیاں دی جاتی ہیں۔ ڈرایا جاتا ہے یہ عوام اور جہلا کی حرکتیں ہیں تعلیمیافتہ ہندو ایسے بے تمیز نہیں ہوتے

مغرب کے قریب اطراف کے مسلمانوں کا گروہ آیا اور کہنے لگا کہ سُنا ہے آپ پر حملہ ہونے والا ہے۔ ہم رات کو آپ کے مکان کا پہرہ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خندق کی لڑائی میں مسلمانوں کی حفاظت کے لئے اپنے آپ پہرہ دیا تھا۔ تم گھروں کو جاؤ۔ میں تمھاری حفاظت کے لئے پہرہ دوں گا۔ اُنھوں نے اصرار کیا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ کیا کہوں۔ ایک پہرہ دار ایسا پہرہ دے رہا ہے جو کسی اور محافظ کی شرکت سے ناراض ہوتا ہے۔ وہ بولے۔ وہ کون ہے میں نے کہا۔ اللہ"

خواجہ صاحب نہ گالیوں کی پرواہ کرتے تھے اور نہ دھمکیوں سے ڈرتے تھے کام میں اتنا انہماک تھا کہ ان باتوں کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ اور دھیان جاتا بھی تھا تو ان باتوں سے لطف لیتے تھے، طبیعت پر میل نہ لاتے تھے۔

آریوں نے تحریر و تقریر کے تیر تو خوب چلائے لیکن قاتلانہ حملہ بظاہر کوئی نہیں کیا۔ ایک حملہ جو ہوا تھا، جس میں خواجہ صاحب کی بجائے خواجہ صاحب کے خسر پیرزادہ محمد صادق کی جان گئی تھی، اُسے بھی میں ثبوت کے بغیر آریوں کا حملہ قرار نہیں دے سکتا۔ ممکن ہے حملہ انارکسٹوں نے کیا ہو۔ انارکسٹ بھی خواجہ صاحب کے درپے تھے۔

ایک دفعہ مولانا عارف ہسوی نے مجھ سے کہا "خواجہ صاحب کل آپ کی وجہ سے بچ گئے" مولانا عارف صوبہ دلی کی کانگریس کمیٹی کے صدر تھے۔ میرا اُن کا بے حد اخلاص تھا۔ وہ تشریف لائے اور کہنے لگے "کل تیسرے پہر اس کرسی پر کوئی اجنبی آکر بیٹھا تھا۔ خواجہ صاحب اس کرسی پر تھے اور باقی تمام کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ اجنبی فقط اسی کرسی پر بیٹھ سکتا تھا"

میں نے ہر سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ مولانا عارف نے کہا۔ اجنبی انارکسٹ تھا۔ خواجہ صاحب کو مارنے آیا تھا۔ لیکن اُسے خواجہ صاحب کے مارنے کی اجازت تھی آپ کے مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ خواجہ صاحب پر فایر کیا جاتا تو آپ بیچ میں تھے اور زد میں تھے۔

"پھر انارکسٹ رات کے وقت خواجہ صاحب کے گھر گیا۔ خواجہ صاحب اور خواجہ صاحب کے بیوی بچے فلاں چھت پر سو رہے تھے" مولانا عارف نے نے کہا۔ "یہ خواجہ صاحب سے پوچھئے گا کہ گرمی میں وہ اور اُن کا خاندان اُس چھت پر سوتا ہے یا نہیں؟۔ انارکسٹ وہاں پہنچ گیا۔ مگر وہاں بھی وہ تنہا خواجہ صاحب کو نہ مار سکتا تھا"

میں نے کہا۔ انارکسٹ کیوں خواجہ صاحب کے پیچھے پڑے ہیں؟ مولانا عارف نے کہا "خواجہ صاحب ہی کے نہیں سوامی شردھانند کے بھی پیچھے ہیں۔ دونوں کی بابت انارکسٹوں کا خیال ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کو انھوں نے برباد کیا ہے اور انھوں نے ملک کی آزادی میں روڑے اٹکائے ہیں۔ لہذا انھیں ختم کر دینا چاہیے۔

میں نے خواجہ صاحب کے کان میں یہ سارا بیان ڈال دیا مگر خواجہ صاحب نے اِسے بھی ایک کان سُنا اور دوسرے کان اڑا دیا۔

انسداد ارتداد کی داستان بہت طویل ہو گئی۔ لیکن خواجہ صاحب کی زندگی کے دوسرے دور میں انسداد ارتداد سے اہم تر اور داستان ہے کونسی؟ نمبر اول کا کارنامہ تصانیف ہیں۔ نمبر دوم کارنامہ انسداد ارتداد۔ بلکہ دونوں کارناموں کو اوّل و دوم کہنا مشکل ہے۔ کسی کو کم درجہ کا کارنامہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

انسداد ارتداد کا کام شروع کرنے کے بعد خواجہ صاحب نے جو کچھ لکھا انسداد ارتدادی کے رنگ میں لکھا۔ کتابیں بھی اور اعلانات بھی۔ انسداد ارتداد کے بعد کی تحریریں کیا، ہر کام پر انسداد ارتداد کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔

انسداد ارتداد کے معنی محض سوامی شردھانند کی تحریک "شدھی" کا مقابلہ کرنے کے نہ تھے۔ تحریک "شدھی" نے خواجہ صاحب کا یہ احساس بیدار کر دیا تھا کہ مسلمان افلاس اور اسلام سے بے خبری کے سبب دولت مند اور تعلیمیافتہ قوموں کا کھاجا بنے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب اس دق سے بچانا چاہتے تھے جو مسلمانوں کو لگ گئی تھی۔ خواجہ صاحب کا انسدادی لٹریچر اسی قسم کا ہے جس میں اسلامی تعلیمات اور افلاس دور کرنے کی تدابیر ساتھ ساتھ ہیں۔

جو خدمت مولانا الیاسؒ کی جماعت چل پھر کر انجام دیتی ہے وہی خدمت خواجہ صاحب زیادہ تر تحریر کے ذریعہ انجام دیتے تھے۔ ہر شہر ہر قصبے اور قریباً ہر گاؤں میں خواجہ صاحب مساجد کے اماموں وغیرہ سے کام لیتے تھے۔ پوسٹر ہینڈبل، ٹریکٹ اور پمفلٹ اماموں کو بھیجتے تھے کہ نمازیوں کو سنائیں۔ تقسیم کریں اور چسپاں کر دیں۔ مولانا الیاسؒ کی جماعت کو "افلاس" کا غالباً اتنا فکر نہیں ہے جتنا خواجہ صاحب کو تھا۔ خواجہ صاحب کی رائے میں افلاس جہالت کی بھی جڑ تھی اور ارتداد کی بھی۔

مولانا الیاس کی جماعت افلاس کی طرف بھی توجہ کرنے لگے تو مولانا الیاس کی جماعت میں مجھے قدیم قسم کا اخلاص اور قدیم قسم کی للّٰہیت جھلکتی دکھائی دیتی ہے بے لوث جماعت ہے۔

خیر انسداد ارتداد یا اصلاح مسلمین کا ذکر تو چلتا ہی رہے گا۔ آئندہ جو دا قعہ آئیگا اسی کا شاخسانہ ہوگا۔ تھوڑی دیر کے لئے آنکھوں اور کانوں کا مزا بدلئے اور خواجہ صاحب کی چند دوسری باتیں سنیئے:۔

خواجہ صاحب کے چند ملفوظات

ایک مسلمان نے سوال کیا۔ فقیر اور درویش کو بچے سے مشابہت کیوں دی جاتی ہے۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا۔ درویش کی شان یہ ہے کہ وہ کھانا کھانے کے بعد دوسرے وقت کا فکر نہیں کرتا کہ دوسرے وقت کیا کھائے گا اور کہاں سے کھائے گا۔ درویش کو کسی سے کینہ و عناد رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ درویش ہر ادنیٰ اور معمولی چیز میں جمالِ یار کا متلاشی رہتا ہے اور اس تلاش و دید سے مسرور ہوتا ہے۔ درویش، دوست اور دشمن کا فرق نہیں کرتا یا کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا یہی حال بچوں کا ہے۔ وہ بھی ایک وقت کا کھانا کھا کر دوسرے وقت سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ اور جب کسی سے اُن کی لڑائی ہو جاتی ہے تو کینہ و عناد نہیں رکھتے جھگڑے کو جلدی بھول جاتے ہیں اور جس سے لڑے تھے اُسی کے ساتھ کھیلنے لگتے ہیں اور معمولی معمولی چیزوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور انھیں اپنا کوئی دشمن نہیں دکھائی دیتا"۔

ایک شخص نے کہا۔ اللہ کہاں ہے۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا"وہ کہاں نہیں ہے"۔ دوسرے نے سوال کیا۔ ضمیر اور من میں کیا فرق ہے جواب دیا

ضمیر مَن کی زبان ہے ۔ مَن کُل ہے ۔ ضمیر اُس کا ایک جزو ہے "

تیسرا بولا ۔ مسمریزم اور توجہ میں کیا فرق ہے ۔ جواب دیا " مقصد کا فرق ہے ۔ مسمریزم کا مقصود دنیا اور اس کا تماشہ ہے ۔ توجہ کا مقصود اللہ اور اُس کے جمال کی دید ہے "

ایک صاحب نے پوچھا ۔ مرض میں کیا دیکھا ۔ خواجہ صاحب نے کہا " اللہ کو برملا دیکھا صحت میں جو نہاں تھا اُسے عیاں دیکھا اور انسان کو مجبور مگر مختار نما دیکھا ۔ جب چند سکنڈ کے لئے حرکت قلب بند اور نبض ساقط تھی ۔ اُس وقت میں کسی بند مکان کا دروازہ ڈھونڈتا پھرتا تھا " وہ صاحب ہنس کر بولے تو شاید موت کی یہی حقیقت ہے ۔ فرمایا " بے ہوشی کو موت سے کیا نسبت ۔ موت نیند کی طرح فرحت بخش شے ہے ۔ موت کو تو میں اپنی بیٹی روحہ سے زیادہ چاہتا ہوں "

اس قسم کی باتیں خواجہ صاحب ہمہ وقت کرتے رہتے تھے ۔ ان باتوں کو جمع کیا جائے تو کتاب بن جائے ۔

" فرماتے ہیں :۔ روح کی حقیقت جو جانتا ہے وہ کہتا نہیں اور جو کہتا ہے وہ جانتا نہیں "

فرماتے ہیں :۔ دواؤں سے آنے والی نیند اچھی ہوا کرتی تو اللہ کی ضرورت نہ رہتی "

فرماتے ہیں :۔ " انسان کو کپڑا آسائش کے لئے درکار ہے ۔ زیبائش تو اُس کے عمل سے ہوتی ہے "

فرماتے ہیں :۔ ہمایوں بادشاہ کی قبر بھی تفریح پسند ہے ۔ جو بات ہندوستان کے زندہ آدمیوں کو میسر نہیں ، وہ چار سو برس کے مُردے کو نصیب ہے ۔ ہمایوں کے مقبرہ کے چاروں طرف باغ ہے اور باغ میں چار بڑے حوض ہیں اور متعدد

چھوٹے حوض۔ سب حوضوں کو پختہ نالیوں نے باہم ملا رکھا ہے۔ اندازاً بیس ہزار گز زمین میں باغ کی سنگین تختہ بندیاں ہیں۔ پہلے یہ حوض کنوؤں سے بھرے جاتے تھے اب گورنمنٹ نے جمنا دریا میں نل ڈلوا دیے ہیں۔ نلوں کا پانی حوضوں کو بھرتا ہے۔ نالیوں میں لہراتا ہے اور باغ میں چلا جاتا ہے۔"

فرماتے ہیں:۔ "انسان اس دنیا کو عیش کا گھر خیال کرتا ہے۔ مگر مجھے کوئی آدمی ایسا معلوم نہیں جسے پورا عیش اور دوامی عیش میسر ہو۔ میرا ایمان تو اس حدیث شریف پر ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جس طرح کسان اپنے کھیت کی ترقی وحفاظت میں عیش و آرام کی پرواہ نہیں کرتا، اسی طرح ہمیں اس دنیا میں عیش و راحت سے بے تعلق ہو کر کام کرنا چاہیے۔"

مولانا محمد علی سے تعلق

۲ راگست ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

خسرو شاہ کا ٹیلیفون آیا ہے کہ مولانا محمد علی صاحب ایک ضروری کام کے لیے ملنا چاہتے ہیں۔ میں خود اُن کے پاس جانے والا تھا۔ کیونکہ وہ بیمار ہیں۔ ان کی پنڈلی پر کاربنکل (سرطان) پھوڑا نکل آیا ہے۔ میرے پاس کشفی شاہ کی بھیجی ہوئی برساتی موجود تھی۔ مگر بارش کی تیزی میں برساتی کام نہیں دیتی۔ بہزار خرابی واحدی صاحب کے ہاں پہنچا اور وہاں سے تنہا مولانا محمد علی کے ہاں گیا اور عشا کے قریب تک رہا۔ مولانا کو بہت تکلیف ہے نقل وحرکت ناممکن ہے۔ تاہم نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ اشاروں سے پڑھتے ہیں۔ مغرب کی نماز میری اقتدا میں ادا کی۔ اُن کے ذوق کا دل پر ایسا اثر تھا کہ گویا وہ امام ہیں

اور میں مقتدی ہوں۔

مولانا محمد علی مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے نصاب لکھوانا چاہتے ہیں اسی کے متعلق بات کرنے بلایا تھا۔ تبلیغ اور دلّی کے حالات پر بھی گفتگو رہی۔

۳ راگست سنہ ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

یہ واقعات سن کر مسلمانوں کی بیکسی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔ آج دہلی کی زمین پر سوائے خدا کے مسلمانوں کا کوئی مددگار نہیں ہے شیخ محمد یعقوب کے ہاں سے مولانا محمد علی کے پاس آیا وہاں کانگریسی لیڈروں کی پوری سبھا موجود تھی۔ مسٹر آصف علی مولانا عارف ہسوی۔ قاری عباس حسین۔ میں نے مولانا محمد علی سے اور ان سب حضرات سے دہلی کے مسلمانوں کی حالت پر بحث کی۔ ان حضرات نے مناسب اور جائز امداد کا وعدہ کیا حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی کے اعلان پر بھی گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ اس بہتان کی آپ سب کو تردید کرنی چاہیئے کہ مسلمانوں نے ہندو عورتوں کی چھاتیاں کاٹ لیں۔ ورنہ دنیا کہے گی کہ مسلمان بڑے سفّاک ہوتے ہیں۔ الزام قطعی غلط ہے۔

مسز نائیڈو اور مہاتما گاندھی کی رائے

۴ راگست سنہ ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد کا خط آیا ہے کہ مسز سروجنی نائیڈو سے اُنکی میری نسبت گفتگو ہوئی۔ مسز نائیڈو نے کہا وہ بے تعصب آدمی تھے

لیکن سوامی شردھانند نے ابتدا کر کے اُنھیں بدل دیا ہے۔

مہاتما گاندھی نے بھی ایک دفعہ خواجہ صاحب کو اپنے ہاتھ سے اُردو میں لکھا تھا کہ میں چاہتا ہوں، آپ اپنا دل بدل لیں۔ قریباً یہی الفاظ تھے۔

خواجہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"میں اپنے نفس کا حساب کرتا ہوں تو میرے اندر کوئی تبدیلی نہیں معلوم ہوتی۔ جیسا تھا، ویسا ہی ہوں۔ اگر اسلام کی خدمت کرنا اور ارتداد کے حملے سے مسلمانوں کو بچانا تعصب ہے تو میرا یہ تعصب پیدائشی ہے۔ اگر خدانخواستہ اس سے محروم ہو جاؤں تو سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام اور ایمان کی نعمت مجھ سے چھین لی۔

میں اس سے ناواقف نہیں ہوں کہ آج تمام ہندوستان کے ہندوؤں کو آریہ سماج میرے خلاف مشتعل کر رہی ہے اور لیڈر مسلمانوں میں ایک شخص بھی میرا ہمدرد نہیں ہے۔ میں تیس کروڑ ہندوؤں کے نرغے میں اکیلا ہوں اور مسلمان لیڈر بلندی پر کھڑے آریوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہاں بے شک حسن نظامی قابلِ ملامت ہے۔ ہم اس سے بیزار ہیں۔ دوسری طرف غریب مسلمان ہیں جو آنکھوں میں آنسو بھرے میری مظلومیت کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ہمارے دل اس شخص کے ساتھ ہیں کیونکہ یہ اسلام کا غلام ہے مگر کیا کریں بڑے بڑے لیڈروں اور تیس کروڑ ہندوؤں کے مقابلے میں ہم اس کی مدد نہیں کر سکتے۔"

الحمدللہ ان تمام باتوں کے باوجود میرا دل مطمئن ہے۔ مجھے گالیاں دی جاتی ہیں۔ میری عورتوں کے نام لے کر فحش الفاظ شائع

کیے جاتے ہیں، مگر میرا دل پریشان نہیں ہوتا۔ اسلام کی غیرت کے آگے ذاتی غیرتیں ہیچ ہیں۔ مجھے چاروں طرف سے قتل کی دھمکیاں دی جاتی ہیں، تب بھی فکر کا کیا موقع ہے۔ اجل میری زندگی کی محافظ ہے مقررہ وقت سے پہلے نہ میں مر سکتا ہوں اور نہ کوئی مجھے مار سکتا ہے۔ اور بالفرض اللہ تعالیٰ اپنے راستے میں میرے خون کی قربانی چاہتا ہے تو میں اپنے دادا حضرت حسین علیہ السلام کی سنت پر بخوشی عمل کرنے کو حاضر ہوں"۔

نیروبی افریقہ میں کوئی مقام ہے۔ وہاں کے ہندو مسلمانوں نے چار سو نوّے روپے جمع کر کے میرے کام کی امداد کے لئے بھیجے ہیں۔ میں اُن میں سے ایک شخص کو بھی نہیں جانتا۔ یا تو یہ فرشتے ہیں یا غیب کے موکل۔ جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم حسن نظامی کے تبلیغی کام کو اپنے اثر اور زور سے بند کرا دیں گے۔ ایسا انتظام کریں گے کہ اسے پھوٹی کوڑی نہ ملے گی۔ جب پیسہ نہیں آئے گا تو کام آپ سے آپ بند ہو جائے گا، وہ ذرا اس غیبی امداد کا تماشہ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے کیسے دُور دراز ممالک میں اپنے دین کے حامی و مددگار پیدا کئے ہیں، اور صرف مسلمان نہیں ہندو مددگار بھی پیدا کئے ہیں۔

ایسا ہی وقت میرے جد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ پر آیا تھا۔ شہنشاہ ہند کو بہکایا گیا کہ حضرت کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا ہے اور ان کی ذات سے سیاسی اندیشے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا، ان کے لنگر میں جو ہزاروں آدمی کھانا کھاتے ہیں اس کا خرچ کہاں سے آتا ہے۔ دشمنوں نے کہا آپ ہی کے دربار کے امرا اور فوجی سردار

والے مسلمانوں کو خیال ہوگا کہ ہمارا غم کرنا اور رونا بس ہمارے ہی لئے ہے اسلام کو یا مسلم قوم کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، لیکن اگر ہم غم کا اظہار اس طرح کریں جیسا کہ ان اعلانوں میں ہے تو بہت بڑے فائدے مسلمانوں کو پہنچیں اور سالانہ ماتمی مجلسیں وہ کام کریں جو کانفرنسیں نہیں کرسکتیں۔

خواجہ صاحب نے ماتم کرنے سے منع نہیں کیا، جیسا کہ عموماً کیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب ماتم کی مخالفت کرکے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں تصادم نہیں کراتے، بلکہ ماتم کو قائم رکھتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں کہ ماتم ایسے پیرائے سے کرو کہ ماتم نتیجہ خیز بن جائے۔

منع کرنے سے ضد نہیں گھٹا کرتی، بڑھ کرتی ہے۔ حضور سرور کائنات کا طریقۂ کار تو یہ تھا کہ عبد یالیل کی سرکردگی میں ثقیف کے سرداروں کا ایک وفد حاضر خدمت ہوا عبد یالیل وہ صاحب ہیں جنھوں نے سنہ نبوت میں حضورؐ کو بے حد ستایا تھا۔ حضورؐ طائف تشریف لے گئے تو وہاں عبد یالیل ہی نے چھوکروں کو حضورؐ کے پیچھے لگایا تھا کہ مذاق اُڑاؤ اور پتھر برساؤ۔

یہ وفد مدینہ منورہ پہنچا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اہل ثقیف میرے قرابتدار ہیں۔ اجازت ہو تو میں انھیں اپنا مہمان رکھوں۔ حضورؐ نے فرمایا اپنی قوم کا اکرام کرنے سے میں تمھیں منع نہیں کرتا۔ لیکن انھیں ایسی جگہ ٹھہرانا کہ اُن کے کانوں میں کلام اللہ کی آواز جائے۔

چنانچہ اُنکے خیمے مسجدوں میں نصب کئے گئے۔ یہ لوگ قرآن سنتے تھے اور مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھتے تھے مگر خدا معلوم کیا اثر پڑا کہ انھوں نے کہا۔ ہم مسلمان ہوتے ہیں، بشرطیکہ نماز سے مستثنیٰ کردیا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا، جس دین میں رکوع وسجود نہیں

والے مسلمانوں کو خیال ہو گا کہ ہمارا غم کرنا اور رونا بس ہمارے ہی لئے ہے اسلام کو یا مسلم قوم کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، لیکن اگر ہم غم کا اظہار اس طرح کریں جیسا کہ ان اعلانوں میں ہے تو بہت بڑے فائدے مسلمانوں کو پہنچیں اور سالانہ ماتمی مجلسیں وہ کام کریں جو کانفرنسیں نہیں کرسکتیں۔

خواجہ صاحب نے ماتم کرنے سے منع نہیں کیا، جیسا کہ عموماً کیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب ماتم کی مخالفت کرکے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں تصادم نہیں کراتے، بلکہ ماتم کو قائم رکھتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں کہ ماتم ایسے پیرائے سے کرو کہ ماتم نتیجہ خیز بن جائے۔

منع کرنے سے ضد نہیں گھٹا کرتی، بڑھ کرتی ہے۔ حضور سرور کائنات کا طریقۂ کار تو یہ تھا کہ عبد یا لیل کی سرکردگی میں ثقیف کے سرداروں کا ایک وفد حاضر خدمت ہوا عبد یالیل وہ صاحب ہیں جنھوں نے سنہ نبوت میں حضورؐ کو بے حد ستایا تھا۔ حضورؐ طائف تشریف لے گئے تو وہاں عبد یالیل ہی نے چھوکروں کو حضورؐ کے پیچھے لگایا تھا کہ مذاق اڑاؤ اور پتھر برساؤ۔

یہ وفد مدینہ منورہ پہنچا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اہل ثقیف میرے قرابتدار ہیں۔ اجازت ہو تو میں انھیں اپنا مہمان رکھوں۔ حضورؐ نے فرمایا اپنی قوم کا اکرام کرنے سے میں تمھیں منع نہیں کرتا لیکن انھیں ایسی جگہ ٹھیرانا کہ اُن کے کانوں میں کلام اللہ کی آواز جائے۔

چنانچہ اُنکے خیمے مسجدوں میں نصب کئے گئے۔ یہ لوگ قرآن سنتے تھے اور مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھتے تھے مگر خدا معلوم کیا اثر پڑا کہ انھوں نے کہا۔ ہم مسلمان ہوتے ہیں، بشرطیکہ نماز سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا، جس دین میں رکوع وسجود نہیں

ہوتا اُس دین میں کوئی خوبی نہیں رہتی۔ انھوں نے پوچھا زنا کی بابت کیا ارشاد ہے ہم لوگ بیشتر وقت سفر میں گزارتے ہیں اور مہینوں گھر سے دور رہتے ہیں حضور نے فرمایا زنا قطعی حرام ہے اللہ کا حکم ہے کہ زنا کے قریب بھی مت جاؤ۔ زنا بے حیائی اور بدراہی کی بات ہے اور اللہ کے غضب و غصہ کا موجب ہے۔ غرض اُنھوں نے سود، شراب اور کئی چیزوں کی بابت پوچھا اور دوٹوک انکار میں جواب پایا۔ مگر جب اُنھوں نے جہاد اور زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہونے کی خواہش کی تو حضورؐ نے فرمایا۔ اچھا تمھیں جہاد کے لیے طلب نہیں کیا جائے گا اور تم سے زکوٰۃ مانگی جائیگی۔ چنانچہ سارا وفد مسلمان ہوگیا حضورؐ نے صحابہ سے کہا اسلام میں شمولیت کے بعد یہ خود بخود جہاد کریں گے، اور زکوٰۃ دیں گے۔

خدارا اس واقعہ سے آج کل کے مسلمان اپنے آپ کو جہاد اور زکوٰۃ سے آزاد نہ قرار دے لیں۔ میں نے حضورؐ کے طریقۂ کار کی لچک دکھانے کے لیے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ بعض باتیں ایسی ہیں جن میں لچک قطعی نہیں دکھائی جاسکتی لیکن بعض باتوں میں لچک کھانے کا جواز اس واقعے سے ملتا ہے۔ لچک کھاتے وقت سوچنا ہوگا کہ صورتِ حال کیا ہے اور کس طبیعت کے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے وہ مومن ہیں یا محض نام کے مسلمان ہیں۔

ایک واقعہ اور سُن لیجیے، عبد یالیل جیسے آدمی کو حضورؐ جہاد سے مستثنیٰ فرماتے ہیں مگر دیکھیے حضرت کعبؓ کے ساتھ جہاد ہی کے معاملے میں کتنی سختی برتتے ہیں۔

غزوۂ تبوک میں کچھ آدمیوں نے شریک ہونے سے پہلو تہی کی تھی۔ زیادہ تر تو اُن میں منافق تھے مگر تین نہایت نیک اور مخلص حضرات سے بھی تساہل ہوگیا تھا۔ ایک حضرت ہلال بن اُمیہ۔ دوسرے حضرت مرارہ بن ربیع۔ تیسرے حضرت کعب بن مالک۔

حضرت کعبؓ اُن بہتر بزرگوں میں ہیں، جنھوں نے مدینے سے نکلے جاکر شروع

اسلام کے وقت اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت کعبؓ کا بیان ہے کہ میری نیت ہرگز جہاد سے گریز کی نہیں تھی۔ میں نے جانے کا پورا اہتمام کر لیا تھا۔ میرے پاس دو اونٹ پہلے کبھی نہیں ہوئے۔ اسی جہاد کے لیے میں نے دو اونٹ خریدے تھے۔ میں اس زمانے میں خوش حال تھا۔ سامان مہیا کرنا مجھے مشکل نہ تھا لیکن اتفاق کی بات، جس دن لشکر اسلام چلا، اسی دن کچھ کام پیش آ گیا۔ میں نے کہا لشکر جاتا ہے تو جائے کل اسے پکڑ لوں گا۔ دوسرا دن بھی لیت و لعل میں گزر گیا اور تیسرا دن بھی۔

تین دن میں لشکر کہیں کا کہیں پہنچ چکا تھا اور اب اُسے پکڑا نہ جا سکتا تھا۔ میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔

اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی تو منافق ہی منافق دکھائی دیے، مسلمان تھے بھی تو وہ جنہیں حضورؐ خود ضرورتاً یا معذور سمجھ کر چھوڑ گئے تھے، ورنہ جہاد ہو اور مسلمان گھر بیٹھا رہے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔

گھونسہ سا لگا کہ لو کعب! تم اور منافق ایک سطح پہ آ گئے۔ حیران تھا کہ کیا کروں سر چکرایا اور دل ڈوبا جاتا تھا۔ منافقوں نے مشورے دیے کہ یوں کہہ دینا اور یوں کہہ دینا۔ یہ بہانہ ہو سکتا ہے اور وہ بہانہ ہو سکتا ہے لیکن بھلا کہیں اللہ اور اس کے رسولؐ سے بہانہ بازی کی جا سکتی ہے۔

حضورؐ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو میں فوراً حاضر خدمت ہوا۔ حضورؐ نے مسکرا کر دریافت کیا۔ کعب کہاں رہے۔

سوال کا اور تبسم کا انداز ایسا تھا کہ میں لرز گیا۔ میں نے کہا۔ حضورؐ! کاہلی اور غفلت نے ہم رکابی کی سعادت سے محروم رکھا اور بُرائی میں مبتلا کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اچھا گھر جاؤ اور اللہ کے فیصلے کے منتظر رہو۔

منافقوں نے طعنہ دیا کہ میاں! یہ سچ بولنے کا نتیجہ ہے۔ ہماری طرح بہانہ

بنا دیتے تو عتاب سے بچ جاتے۔ میں نے کہا۔ دیوانے ہو۔ معاملہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے ہے۔ جھوٹ چھپا رہ نہیں سکتا۔

میں نے معلوم کرایا کہ جو حکم میرے واسطے صادر کیا گیا ہے وہ کسی اور کو بھی دیا ہے یا نہیں۔ پتہ چلا کہ مرارہ اور ہلال دو اور میری طرح یہی حکم پا چکے ہیں۔

یہ اطمینان بخش بات تھی۔ حضورؐ نے جن پر خصوصی توجہ نہیں کی تھی انھیں حضورؐ جانتے تھے کہ منافق ہیں۔ منافقوں کی گرفت کرنے سے کیا حاصل تھا۔ جن کے ساتھ مجھے شامل فرمایا تھا وہ سچے مسلمان تھے۔

حضورؐ نے پہلے حکم کے بعد دوسرا حکم صادر کیا کہ مسلمان کعب۔ مرارہ اور ہلال سے بول چال بند کر دیں۔

مرارہ اور ہلال بوڑھے تھے۔ وہ گھر میں گھس کر بیٹھ گئے مگر میں نے مسجد نبوی کی حاضری نہیں ترک کی۔ حاضر ہوتا اور حضورؐ کی نگاہیں دیکھتا رہتا۔

مسلمان میرے سلام تک کے روادار نہ تھے۔ ایک روز میں اپنے چچا زاد بھائی ابو قتادہ کے باغ گیا۔ ابو قتادہ باغ میں مکان تعمیر کرا رہے تھے، میں نے سلام کیا۔ انھوں نے جواب نہیں دیا۔ منہ پھیر لیا۔ میں نے کہا۔ ابو قتادہ! تم خوب واقف ہو میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں اور منافق نہیں ہوں، تم مجھ سے بولتے کیوں نہیں۔ ابو قتادہؓ نے ہوں۔ ہاں نہیں کی۔ جب اصرار کیا تو بس اتنا کہا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہی حقیقت سے واقف ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ابو قتادہ میرے بھائی ہی نہیں تھے دوست بھی تھے۔ روتا ہوا گھر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں ایک عیسائی ملا۔ اُس نے کہا۔ میں تو تمھیں ڈھونڈتا پھرتا ہوں، یہ شرجیل حاکم غسان کا خط لایا ہوں۔

شرجیل نے لکھا تھا:-

"تمھارا آقا تم سے خفا ہو گیا ہے اور سب تم سے عدم تعاون کر رہے ہیں۔ ہمیں تمھاری حیثیت کا علم ہے۔ تم سے اس قسم کا سلوک زیادتی ہے۔ تم یہاں آجاؤ۔ یہاں تمھارے ساتھ عزت کا سلوک کیا جائے گا۔"

میں نے شرجیل کا خط قاصد کے سامنے آگ میں ڈال دیا۔ اور کہا شرجیل کی مہربانی سے میرے آقا کی خفگی بہتر ہے۔

میرا غم اور بڑھ گیا کہ ایک عیسائی نے مجھے کفر کی دعوت دی۔ نہ میں ایسی غلطی کرتا۔ نہ اُسے اتنی جراءت ہوتی۔

گھر پہنچا تو حضورؐ کا تیسرا حکم موجود تھا کہ بیوی سے علیحدہ رہو۔ میں نے پوچھا طلاق کے لئے فرمایا ہے۔ کہا نہیں۔ فقط علیحدہ رہنے کو فرمایا ہے۔ میں نے بیوی کو اُن کے میکے بھیج دیا۔

ہلال اور مرارہ کے پاس بھی یہ حکم گیا تھا۔ ہلال کی بیوی نے جا کر عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ہلال ضعیف ہیں اور ان کی خدمت کرنے والا سوائے میرے اور کوئی نہیں ہے۔ حضورؐ نے اجازت دیدی کہ اُن کی ضروری خدمت کر دیا کرو۔

لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تمھاری بیوی بھی ضروری خدمت انجام دے سکتی ہیں تم بھی اجازت لے لو۔ میں نے کہا نہیں مجھ میں اپنا کام کرنے کی طاقت ہے۔

المختصر پچاس دن اسی طرح گزر گئے۔ ایک شب میں چھت پر لیٹا تھا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کوہ سلع پر چڑھ کر ندا دی "کعب کو مبارک ہو کہ اُس کی توبہ اللہ تعالیٰ نے قبول کر لی۔"

مسلمان اعلان سُن کر مبارک باد دینے کے لئے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں سجدہ شکر بجا لایا اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضورؐ مہاجرین اور انصار کے

درمیان تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھ حضورؐ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ حضورؐ نے بھی مبارک باد دی اور فرمایا۔ آج سے بہتر دن تمھیں اب تک میسر نہیں آیا تھا۔

خیر تو کہنا یہ ہے کہ ماتم کو روکنے سے ماتم کرنے والے ماتم نہیں چھوڑ سکتے آپنے کسی فرقے پر روک ٹوک کا اچھا اثر ہوتے نہ دیکھا ہوگا۔ بھلا کسی فرقے نے بھی اپنے مخصوص عقیدے اور عمل میں کبھی فرق کیا ہے۔ خواجہ صاحب جانتے تھے کہ میرے مخصوص عقاید و اعمال پر کوئی اعتراض کرتا ہے تو میں کیا اثر لیتا ہوں۔ دوسرے فرشتے نہیں ہیں جو وہی اثر دہ نہ لیں۔

خواجہ صاحب کی ایک کتاب ہے، "مرشد کو سجدہ تعظیم" جب وہ شائع ہوئی تو میں نے نظام المشائخ میں بائیس تیئیس صفحے کا طویل مضمون اُس کے خلاف لکھا مگر خواجہ صاحب نے میرے لکھنے کا مطلق بُرا نہ مانا۔ بلکہ منادی میں اعلان کیا کہ واحدی صاحب کی بعض دلیلیں ایسی ہیں کہ "مرشد کو سجدہ تعظیم دوبارہ چھپی تو واحدی صاحب کے لکھنے کے مطابق ترمیم کردوں گا۔ اور جن دلیلوں سے مجھے اتفاق نہیں ہے انھیں بھی بطور ضمیمہ درج کردوں گا۔ تاکہ جو شخص واحدی صاحب کی اُن دلیلوں کو صحیح ماننا چاہے تو مان لے۔

ظاہر ہے کہ میرا اختلاف اختلاف تھا، مخالفت نہ تھا۔ خواجہ صاحب میری نیت سمجھتے تھے۔ نیز میرے اختلاف کا لہجہ مودبانہ تھا میں نے متمردانہ اختلاف نہیں کیا تھا خواجہ صاحب اس کا بُرا کیوں مانتے۔

یہ انداز اختلاف مجھے خواجہ صاحب ہی کے فیض صحبت سے ملا ہے۔ محرم کے اُن اعلانات پر خواجہ صاحب کو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی زیارت ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں:۔

خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسینؑ تشریف لائے ہیں۔ ایک حبشی

غلام موجود ہیں کر رہا ہے۔ اُس نے کہا۔ میاں اُٹھو۔ سرکار ؐ تمھارے پاس تشریف لائے ہیں۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ جوتیاں پاؤں سے ٹٹولیں مگر وہ نہ ملیں۔ ننگے پاؤں ہاتھ جوڑے خدمت میں پہنچا۔ حضرت کے ہاتھ میں میرے تازہ تبلیغی اعلان تھے، جو محرم کے واقعات پر پرسوں شائع ہوئے ہیں۔

فرمایا۔ بیٹا۔ میں نے انھیں پڑھ لیا۔ تم نے بہت اچھا لکھا ہے اب تم اس دنیا سے میرے پاس آنے والے ہو۔ چلو تمھاری قبر تمھیں دکھا دوں۔

یہ فرمانا تھا کہ مکان کی شکل بدل گئی۔ ایک عالی شان مکان پیش نظر تھا، جس میں چاندی کا تخت بچھا تھا اور بہت سے آدمی دست بستہ کھڑے تھے۔ اُس تخت پر ایک بزرگ سبز لباس پہنے تشریف فرما تھے اُن کے بال بہت ہی سفید تھے۔ زُلفیں بھی سفید برف تھیں۔ ہَوا تیز چل رہی تھی اور زُلفیں اُڑ رہی تھیں۔

حضرت امام حسین ؑ نے تخت کے سامنے پہنچ کر سلام علیک یا رسول اللہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کمزور آواز میں جواب دیا وعلیک السلام یا حسین۔

اس کے بعد حضرت امام حسین ؑ نے میرے اعلانات تخت پر رکھ دیئے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ حضور ؐ نے اعلانات پر نظر ڈالی اور پھر مجھے دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ فرمایا۔

تھوڑی دیر میں تازی تازی کھجوروں کا خوان آیا اور حضور ؐ نے کھجوریں اپنے ہاتھ سے تقسیم کیں۔ مجھے بھی قریب بلا کر کھجوریں دیں اور

آہستہ سے کہا۔ عُمُرُکَ عُمُرِیْ وَ رُمَاحُکَ رُمَاحِیْ
تیری عمر میری عمر اور تیرا نیزہ میرا نیزہ۔ حاضرین نے آمین
کا نعرہ لگایا۔

خواجہ صاحب کی سُوجھ

سُوجھ کا خواجہ صاحب کی جواب نہ تھا۔ آپ مٹی کے پُرانے اور بجیال خویش
بے کار برتن توڑ ڈالئے اور پھر خواجہ صاحب سے دریافت کیجئے کہ ان ٹھیکروں کا کیا
کروں؟ کیا یہ بھی کار آمد ہو سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب اب دنیا میں موجود نہیں ہیں
لیکن ٹھیکروں پر اُن کا ایک مضمون موجود ہے جو آپ کو بتا دے گا کہ ٹھیکرے کس
کس مصرف میں آسکتے ہیں۔

مسلمانوں کا افلاس دُور کرنے کے لئے خواجہ صاحب نے جتنی کتابیں وغیرہ
لکھی ہیں، سب غیر معمولی سُوجھ کا پتہ دیتی ہیں۔ کاش خواجہ صاحب سے صرف اسی
قدر کام لیا جاتا کہ وہ بیٹھے لکھتے رہتے تو خواجہ صاحب تاBorn schemists
پیدائشی مجوّز اور Born propagandist پیدائشی مبلغ تھے۔
خواجہ صاحب کو تجویزوں پر عمل کرانے کے واسطے دوڑا دوڑا پھرنا بھی پڑتا تھا۔
عمل کرانے والے اور ہونے چاہیئے تھے، عمل کرانے والے اور تھے مگر خواجہ
صاحب کے معیار کے نہ تھے۔ معیار کے عمل کرانے والے افسوس میسر نہ آئے۔
بہر حال خواجہ صاحب نے بے شمار نعمتیں پائی تھیں، اُن میں عظیم ترین
نعمت سوجھ تھی۔

خواجہ صاحب کی گاندھی جی سے ایک تاریخی گفتگو

"شدھی" اور "انسداد ارتداد" کے دور میں خواجہ صاحب اور مہاتما گاندھی

کی ملاقاتیں تو متعدد ہوئیں۔ مہاتماجی خواجہ صاحب کے پاس بستی نظام الدین اولیاؒ جاتے تھے اور خواجہ صاحب مہاتماجی سے ملنے دلی آتے تھے۔ لیکن ملاقاتوں کا حال ایسا محفوظ نہیں ہے، جسے مستند کہہ کر پیش کیا جا سکتا۔ البتہ ایک ملاقات کا حال خواجہ صاحب نے اپنے ۸ر اگست کے روزنامچے میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:-

مہاتما گاندھی مولانا محمد علی کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کل ٹیلیفون پر بات کی تھی آج شام کو سات بجے ملنا ہے۔ اس لئے ساڑھے چھ بجے واحدی صاحب کے بالاخانہ پہنچ گیا۔ مولانا محمد علی کا مکان بالاخانہ کے سامنے ہے۔ پونے سات بجے دیکھا کہ چار موٹریں نیچے سے گزریں۔ اگلی موٹر میں مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی تھے۔ باقی موٹروں میں اُن کے رفقار تھے۔ مولانا محمد علی اور مہاتما گاندھی نے اشارے اور آواز سے کہا۔ آٹھ بجے آیئے گا۔ یعنی سات بجے نہیں۔ میں واحدی صاحب کے ہاں رُک گیا۔ مہاتما گاندھی اس وقت اُن جگہوں کا معائنہ کرنے گئے ہیں جہاں ہندو مسلمان لڑے تھے۔ آٹھ بجے بھی واپس نہ آسکے۔ نو بجے مہاتماجی نے آدمی بھیجا اور میں بھتیجا احسان کے ساتھ اُن کے ہاں گیا دروازے پر ہندو رضاکاروں کا پہرہ تھا مگر میری روک ٹوک نہیں ہوئی۔

مہاتما گاندھی مولانا محمد علی کے خاص کمرے بیٹھے تھے۔ اُن کے سرہانے دیوار کے اوپر قرآن مجید کی آیت

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا

سنہرے حرفوں میں چمک رہی تھی۔ مہاتماجی کے گرد دہلی۔ اور ہندوستان کے چند نامور ہندو مسلمان لیڈر جمع تھے۔ میرے

پہنچتے ہی مہاتما جی ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور حاضرین دوسرے کمروں میں چلے گئے۔ میرے اور بھیا احسان کے سوا کوئی نہیں رہا۔

مہاتما جی نے گیارہ بجے کے بعد تک گفتگو کی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا:۔

مہاتما جی۔ آپ کے دونوں خط پہنچ گئے تھے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے لئے یا کسی اور کے لئے اپنے کام میں تبدیلی پیدا نہ کریں اور اپنے دل کو نہ بدلیں، بلکہ اسلام کے لئے ایسا کرنے کی ضرورت ہے۔

حسن نظامی:۔ میں نہیں جانتا کہ دل کیونکر بدلنا چاہئے۔ اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ میں اپنے تبلیغی کام کے مقصد کو نیک نیتی سے مقرر کروں، تو یہ بات تو پہلے ہی موجود ہے۔ میری نسبت آریہ اخبارات جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ سراسر غلط ہے۔ میں ہندوؤں کے بچوں کو بھگا کر اور ہندو عورتوں کو اغوا کر کے مسلمان کرنے کو اسلامی تعلیم کے خلاف سمجھتا ہوں۔ میں نے اس کا اعلان بھی کر دیا ہے، اور برابر اعلان کرتا رہتا ہوں۔ جہاں جہاں میرے رفیق کام کر رہے ہیں وہاں ان میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہیں کرتا اور نہ کوئی کام اسلام کے خلاف تبلیغ کے سلسلہ میں نہیں کیا جاتا۔

میرا کام تین قسم کا ہے۔ (۱) مسلمانوں کو ان کے مذہب سے آگاہ کرنا اور مذہبی فرائض پر عمل کرانا۔ (۲) مسلمانوں کی مالی اصلاح یعنی انھیں مقدمہ بازی۔ سودی قرضداری اور فضول خرچی کی رسموں سے بچانا اور مفید پیشوں اور تجارتوں میں لگانا۔ یہ دونوں قسمیں تو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ البتہ تیسری قسم کام کی

کمین اور اچھوت لوگوں سے تعلق رکھتی ہے۔ کمین اور اچھوت لوگوں کو اسلام سے واقف کیا جاتا ہے۔ اُنھیں صفائی ستھرائی کی نصیحت کی جاتی ہے۔ اور اُنھیں اُن کے انسانی حقوق بتائے جاتے ہیں۔ میری اپنے رفیقوں کو ہدایت ہے کہ کسی غیر مسلم سے مناظرہ نہ کرو۔ اور فتنہ و فساد سے دور رہو۔

مہاتما گاندھی۔ میں اِسے نہیں مانتا کہ اچھوت اور کمین قومیں اسلام کی تعلیم سمجھنے کی قابلیت رکھتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس بہانے سے مسلمان کی جاتی ہیں کہ اُن کے سامنے ہندوؤں کے مظالم بیان کئے جاتے ہیں کہ ہندو تھیں حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ اپنے ساتھ کھانا نہیں کھلاتے۔ اپنے مندروں میں نہیں گھُسنے دیتے۔ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو مسلمانوں کے برابر کے بھائی بن سکو گے۔ تو بس یہ کہنا محض دنیاوی ہے۔ مذہب سے اِسے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ مذہبی بات جب ہوتی جب وہ اسلام کی خوبیاں سمجھ کر مسلمان ہوتے۔ چونکہ یہ بات نہیں ہے لہذا میں آپ کے کام کی تائید نہیں کر سکتا۔ میں اسے مانتا ہوں کہ تبلیغ کرنا آپ کا حق ہے۔ مگر اچھوت ہندوؤں میں تبلیغ کی میں تائید نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اُن کے دماغ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ اسلامی تعلیم کو سمجھ سکیں۔ میں نے آپ کی وہ تحریر پڑھی ہے کہ اگر سات کروڑ اچھوت مسلمان ہو جائیں تو مسلمانوں کی تعداد چودہ کروڑ تک پہنچ جائے گی اور مسلمانوں میں ہندوؤں کے برابر طاقت آجائیگی۔ یہ آپ کا مذہبی بیان نہیں تھا دنیاوی تھا۔

میں بہت خوش ہوں کہ آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی۔ مگر

خلافت کا لالچ دیکر آپ نے مجھے دُکھ دیا۔ پھر بھی میرے دل میں اس دعوت کی عزت ہے، مگر میں یہ پسند نہیں کرتا کہ آپ مجھے چھوڑ کر میرے بیٹے یا میرے نوکروں کو تبلیغ کرنے لگیں۔ کیونکہ اگر میں مسلمان ہوجاؤں تب تو وہ سب بھی مسلمان ہوجائیں گے۔ اور صرف اُن کو مسلمان کیا جائے تو مجھے اُن کے جدا ہونے کے باعث بہت رنج ہوگا۔

حسن نظامی۔ میں اس دو سال کے تبلیغی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اچھوت کسی ذریعہ سے بھی اسلام لائے ہوں لیکن رفتہ رفتہ ان کے اندر اسلامی تعلیم سمجھنے کی قابلیت آجاتی ہے۔ اور گزشتہ زمانے میں تو ان میں ایسے لوگ گزر چکے ہیں جو مکمل تعلیم حاصل کر کے اور اس کے مطابق عمل کر کے مسلمانوں کے پیشوا بنے تھے۔

آپ کو میں نے خلافت کا لالچ نہیں دیا نہ خلافت کا دنیا میرے اختیار کی چیز ہے۔ میں نے تو بس یہ لکھا تھا کہ "شاید خلافت کی جگہ خالی اسی واسطے ہوئی ہو کہ آپ مسلمان ہوجائیں اور قدرت آپ کو وہ جگہ دے۔"

سات کروڑ اچھوتوں کے مسلمان ہونے کی نسبت آپ نے جو کچھ فرمایا وہ ٹھیک ہے۔ میں نے یہی لکھا تھا جو آپ نے سمجھا، اور میں اسے بھی مانتا ہوں کہ میرا یہ لکھنا دنیاوی تھا۔ مگر یہ سوامی شردھانند کے ایک اعلان کا جواب تھا۔ اُنھوں نے بیان دیا تھا کہ "ہندو مسلمانوں سے بہت کمزور ہیں، لہٰذا اس کی بڑی ضرورت ہے کہ سب نومسلم راجپوتوں کو آریہ بنا لیا جائے تاکہ ہندو مسلمانوں کے مقابلے

میں مضبوط ہو جائیں اور مسلمانوں کے گلے کا گھنٹہ نہ بنے رہیں ؟ تاہم میں آئندہ اس کا خیال رکھوں گا کہ میرا تبلیغی کام خالص مذہبی حیثیت کا ہو، میں آپ کے مشورے کی قدر کرتا ہوں اور آپ کا منشا سمجھ گیا ہوں مجھے یقین ہے کہ اسلام کی تعلیم اتنی سادہ اور آسان ہے کہ اگر میں اچھوتوں کو دنیاوی باتوں سے علیحدہ ہو کر خالص دینی طریقے سے بتاؤں گا تو بھی مجھے کامیابی ہو جائے گی۔

مہاتما جی۔ مجھے کل ہی ایک گجراتی زبان کی کتاب ملی ہے جسے آپ کے نام ڈیڈیکیٹ کیا گیا ہے۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ اس کے اندر ضرور کوئی تبلیغی بات ہوگی۔ میں نے مہادیو ڈیسائی کو وہ کتاب دی کہ پڑھ کر بتاؤ اس میں کیا ہے۔ آج ڈیسائی نے بتایا کہ ہاں اس میں وہی بات ہے جو آپ کے خیال میں آئی تھی۔

حسن نظامی۔ اس کتاب کا نام دشوا دھرم ہے۔ یہ میرے دوست مسٹر ولی محمد مومن، پرائیویٹ سکرٹری بیگم صاحبہ ریاست ماناودر نے لکھی ہے۔ اس میں وہ مضامین ہیں جو گجراتی اخبار خلافت بمبئی پہلے چھاپ چکا ہے۔ میں گجراتی نہیں جانتا لیکن میں نے سنا ہے کہ ان مضامین میں کوئی بات کسی کے مذہب کے خلاف نہیں ہے۔

مہاتما جی :۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ گجراتی سے ناواقف ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی بات کسی کے مذہب کے خلاف نہ ہو لیکن اس کے اندر کوئی ایسی پوشیدہ حکمت عملی ہوگی جو ہندوؤں کو اپنے مذہب سے برگشتہ کر دے، اور یہی چیز ہے جسے میں پسند نہیں کرتا۔ آغا خانیوں کے متعلق بھی اسی قسم کا بہت سا لٹریچر میرے پاس جمع ہو گیا ہے،

اور سنتا ہوں کہ اُن کے لٹریچر میں بھی اسی قسم کی حکمت عملیاں ہیں۔

حسن نظامی۔ ممکن ہے مسٹر ولی محمد مومن کی کتاب میں اور آغاخانیوں کی کتابوں میں حکمت عملیاں ہوں، مگر آریہ سماجی جن طریقوں سے مسلمانوں کو مرتد کرتے ہیں وہ تو جھوٹ، دھوکے اور فریب کی حد تک پہنچ جاتے ہیں ایسی حکمت عملی جو انسان کی عقل پر اثر کرے جھوٹ۔ دھوکے اور فریب کے مقابلے میں ناپسندیدہ نہیں ہو سکتی۔

مہاتما جی:۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کے اندر بہت برداشت ہونی چاہیے، کیونکہ مجھے روزانہ معلوم ہوتا ہے کہ آریہ سماجی سب مبلغین اسلام کے مقابلے میں آپ کی زیادہ مخالفت کرتے ہیں اور آپ کو سب سے بڑھ کر خطرناک کہتے ہیں۔ میں ابھی سوامی شردھانند سے مل کر آیا ہوں، آج بھی انھوں نے آپ ہی کی شکایت کی تھی۔ اس واسطے میں چاہتا ہوں کہ آپ تمام ہندوستان کے اس مخالفانہ طوفان کو صبر سے برداشت کیجئے۔

حسن نظامی:۔ مجھے ان مخالفتوں اور حملوں کی مطلق پرواہ نہیں ہے میں انھیں اپنی مخالفت نہیں سمجھتا۔ میں تو شکار کی ٹٹی بنایا گیا ہوں درحقیقت آریہ سماج کا منشا یہ ہے کہ سارے ہندوستان کے ہندو آریہ بن جائیں اور اس کے لئے وہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ مجھے ہندو قوم کو نگل جانے والا اژدھا مشہور کر کے ہندوؤں کو خوفزدہ کر دیں اور ہندوؤں کو یقین دلا دیں کہ ساری ہندو قوم خطرے میں ہے اور آریہ سماج کے سوا کوئی طاقت ہندو قوم کو اس خطرے سے نہیں بچا سکتی۔ سب ہندوؤں کو آریہ بنانے کے لئے میری مخالفت

کی جاتی ہے اور مجھ پر بہتان لگائے جاتے ہیں، تو پھر میرا اس مخالفت سے اثر لینا فضول ہے۔

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ سات دن میں دو دن آپ چپ کا روزہ رکھتے ہیں، یہ مذہبی بات ہے یا دنیاوی، پہلے پیغمبروں کے وقت میں بھی چپ کا روزہ رکھا جاتا تھا اور مسلمان درویشوں میں بھی اس کا رواج تھا۔ مگر وہ آپ طرح چپ کا روزہ نہیں رکھتے تھے۔ آپ تو سب کی باتیں سنتے ہیں اور انھیں لکھ کر جواب بھی دیتے ہیں۔ آپ کے کان آپ کی آنکھیں اور آپ کا دماغ برابر کام کرتے رہتے ہیں، پھر فقط زبان کو خاموش رکھنے سے کیا فائدہ ہے۔

مہاتما جی :- میرا ایک روزہ مذہبی ہے اور ایک دنیاوی۔ میں دنیاوی روزے میں اخبار کا کام کرتا ہوں۔ ہندو تعلیم میں پانچ حواس کا روزہ بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر پانچ حواس میں سے ایک حواس یا ایک خواہش کو بھی قابو میں رکھا جائے تب بھی فایدہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ فقط جیب بند رکھنا کچھ زیادہ اعلیٰ درجے کی بات نہیں ہے مگر آدمی سے جتنا بھی ہو سکے اُسے کرنا چاہیئے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ چرخہ کاتا کریں۔

حسن نظامی :- میں نے آپ کی تحریکوں میں صرف کھدر کو قبول کیا ہے کھدر میں پہنتا ہوں مگر چرخہ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ البتہ آپ کے چرخے کے متعلق بیانات کا لطف ہر وقت کانوں میں گونجتا رہتا ہے اور جب میں کسی کو چرخہ چلاتے دیکھتا ہوں تو آپ کا یہ فقرہ ضرور یاد آجاتا ہے کہ چرخے کی آوازیں سب راگوں سے بڑھ کر راگ ہے۔

صوفیوں میں ترگی (محمودہ اور سلطان الاذکار) شغل کے وقت ایک خاص شر کا تصور کیا جاتا ہے اور میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ترگی کے لئے چرخے کا سُر بہترین سُر ہے، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سب چرخہ کیوں کاتیں۔

اسکے بعد مہاتما گاندھی جی نے چرخے کے اقتصادی فایدے تفصیل سے بیان کئے اور آخر میں، میں نے کہا، میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں، اس کا جواب میں شائع کروں گا۔ سوال یہ ہے کہ آپ کو اسلام میں سب سے اعلیٰ درجہ کی اچھی چیز کونسی معلوم ہوتی ہے۔

مہاتما جی نے کہا، میں اسلام کی اخوت کو سب سے اعلیٰ چیز سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے وحدانیت ہندو مذہب میں بہت اچھی ہے۔ مگر اخوت اسلام جیسی ہندوؤں یا اور کسی مذہب میں نہیں ہے۔

اس کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ جو اخوت اسلام نے سکھائی تھی اور جس کا پیغام اسلام لے کر آیا تھا وہ آج کل مسلمانوں میں باقی نہیں ہے۔

اس پر مولانا محمد علی صاحب نے جو اجازت لے کر ہماری خلوت میں آگئے تھے آیت کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً پڑھی یعنی دنیا بھر کے آدمی ایک ہی قوم ہیں۔ اور مولانا محمد علی نے مہاتما جی کو اسلامی اخوت کی تشریح سمجھائی۔

گیارہ بج چکے تھے۔ میں مہاتما جی سے رخصت ہوا اور مولانا محمد علی اُنھیں چرخے کا کام دکھانے کے لئے اپنے کمرے میں لے گئے۔"

آنکھوں اور کانوں کا مزا بدل لیجیے

خواجہ صاحب کے جسم پر دو زخم ہو رہے تھے۔ ۲۲ر اگست ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں اُن کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں کو درحقیقت یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ اُن کے جسم پر بھی زخم پڑے ہوئے ہیں، ورنہ وہ بھی اسی طرح بے قرار رہتے جس طرح میں رات بھر مجازی زخموں سے بے قرار رہا اور اُنھیں بھی راتوں کو نیند نہ آتی۔ اور اُن کی غفلت کی نیندیں جاتی رہتیں۔ جو وقت آگے آنے والا ہے وہ مجھے بہت ہی خطرناک معلوم ہوتا ہے معلوم نہیں مسلمانوں کی غریب قوم کا اس ملک میں کیا انجام ہوگا، جس کے رہنما خطرے سے غافل ہیں اور جس کے افراد بے خبر پڑے سوتے ہیں، مجھ جیسے اس سرزمین پر ہزاروں کیڑے پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں میں بھی ایک دن ختم ہو جاؤں گا لیکن آئندہ نسلیں یاد کریں گی کہ حسن نظامی نے کیا کہا تھا۔"

آنکھوں اور کانوں کا مزا نہیں بدلا۔ میں نے غلط عنوان قائم کر دیا ہے خیر اس غلطی کو یونہی رہنے دیجیے۔

۲ر ستمبر ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

"طبیعت بہت خراب ہے اگرچہ ہوا خوری کو گیا اور دیر تک پھرتا رہا۔ لیکن طبیعت پر کچھ اثر نہ ہوا۔ دماغ معطل ہے۔ مزاج میں وحشت غصہ۔ ہر ایک شے سے بیزاری ہے۔ تاہم ایک چیز جسم کے اندر ایسی محسوس کرتا ہوں کہ وہ ان سب تکلیفوں سے جُدا ہو کر جسم کی حالت کو

سمجھتی ہے اور مجھے بتاتی ہے کہ اب تیرا یہ حال ہے اور اب تجھے یہ اذیت ہے۔ وہ چیز کیا ہے؟ درحقیقت حسن نظامی اُسی چیز کا نام ہے جو جسم اور اُس کے تمام حواسوں سے بالاتر ہے۔ پس جب اصلی حسن نظامی جسمانی حسن نظامی کی تکلیفوں کو دیکھتا ہے تو جسم کو عالم اسباب کی حکمتیں سمجھا کر مطمئن کر دیتا ہے۔"

"خسرو شاہ (فرزند حکیم نابینا صاحب) کو حال لکھا اُس کے جواب میں دوائیں لے کر وہ خود آ گئے۔ ایسا خلوص اور ایسی محبت ابر کی اس اندھیری رات میں ہر شخص کو میسر نہیں آسکتی یہ نعمت اللہ نے مجھے ہی دی ہے وہ رخصت ہوئے۔ میں سو گیا۔ مگر گھنٹہ بھر بھی نیند نہ آئی تھی کہ بارش کا طوفان آیا۔ ایسی کڑک اور چمک سارے موسم میں نہ دیکھی تھی معلوم ہوتا تھا۔ تمام یورپ کی توپیں بادلوں کے پاس ہیں اور وہ لگاتار چل رہی ہیں، در و دیوار لرزتے تھے اور میرا دل خوف خدا سے کانپ رہا تھا بارش دو گھنٹے مسلسل ہوتی رہی اور میری نیند کو بھی بہا لے گئی۔"

مہاتما گاندھی سے ایک اور ملاقات

۱۴ ستمبر ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

"دو بجے مہاتما جی اور حکیم اجمل خاں کے ساتھ بھیّا احسان کے مکان پر آیا۔ خواجہ بانو اور حور بانو بھی مہاتما جی کو دیکھنے بھیّا کے ہاں پہنچ گئیں۔ مہاتما جی ایک گھنٹہ ٹھیرے، فرماتے تھے۔ آپ نے جو کچھ مجھ سے کہا میں اُس کو مانتا ہوں، آپ کے چہرے اور آپ کی باتوں نے مجھے یقین ہوتا ہے کہ آپ کا بیان صحیح ہے، لیکن مجھ سے کہا جاتا ہے اور یہ

ایک مسلمان نے بھی کہا کہ خواجہ صاحب بڑے ناٹکی آدمی ہیں۔ وہ وعدہ کرلیں گے۔ کام وہی کرتے رہیں گے جو کر رہے ہیں، وہ تمام ہندؤں کو مسلمان کرلینا چاہتے ہیں۔ اُن کی سازش بہت گہری اور بہت خفیہ ہے۔

میں نے کہا کہ اس بدگمانی کا تو کچھ علاج نہیں ہے۔ نہ آپ کو مکاشفہ ہوتا ہے جو میرے باطنی حالات معلوم کرلیں اور نہ مجھے ایسی کوئی ترکیب معلوم ہے کہ میں اندرونی کیفیت آپ کو دکھادوں۔

جس سازش کے مجھ پر الزام لگائے جاتے ہیں، میں اُس سے پاک ہوں، اس لئے میرا ضمیر مطمئن ہے اور میں الزاموں کی طرف دھیان نہیں دیتا۔

میرا لٹریچر ہندو چھاپہ خانے چھاپتے ہیں اور انگریزی ڈاک خانوں کے ذریعہ تقسیم ہوتا ہے جس کے اہل کار عموماً ہندو ہیں۔ پس جو چیز ہندؤں کے ہاں چھپے اور ہندؤں کے ہاتھوں سے تقسیم ہو اُسے خفیہ سازش کس طرح کہا جاسکتا ہے۔ اب تو ایک ہی چارہ نظر آتا ہے کہ میں احمد آباد میں آپ کے آشرم کے قریب رہوں تاکہ آپ میرا کام خود دیکھتے رہیں۔ مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچانا اور ہندؤں کو مسلمان ہونے کا پیغام دینا میرے مذہبی فرائض ہیں انھیں میں نہیں چھوڑ سکتا۔

مہاتما جی نے کہا:۔

میں آپ کے ان فرائض کو چھوڑنے کی خواہش نہیں کرتا۔ آپ

شوق سے یہ کام کیجیے۔

اس کے بعد مہاتما جی نے گلبرگہ فساد کے متعلق بیان کیا کہ میرے خاص آدمی تحقیقات کے واسطے وہاں گئے تھے اور انھوں نے مجھے رپورٹ بھیجی ہے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کا قطع کلام کرکے پوچھتا ہوں کہ آپ کے آدمیوں نے تحقیقات میں کہیں میرا نام بھی سنا۔ مہاتما جی نے ہنس کر جواب دیا۔ نہیں نہیں، میرے آدمیوں نے آپ کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ میں نے کہا۔ مگر آریہ اخبارات یہ لکھ رہے ہیں کہ گلبرگہ کا فساد حسن نظامی کی سازش سے ہوا۔

پھر گفتگو اور باتوں پر ہونے لگی۔ میں نے حکیم اجمل خاں صاحب سے مخاطب ہوکر کہا۔ مہاتما جی کے لیے سب سے بڑی دعا یہ ہے کہ اللہ انھیں تکبر سے بچائے۔ تمام دنیا میں ان کی ہر دلعزیزی ترقی کر رہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ مہاتما جی کا نفس انھیں مغرور نہ کر دے۔ حکیم صاحب نے مسکرا کر فرمایا۔ مجھے یہ اندیشہ نہیں ہے۔

مہاتما جی بولے۔ نہیں نہیں خواجہ صاحب سچ کہتے ہیں۔ یہ دعا بہت ضروری ہے۔

حسرت موہانی کی رائے

۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں :۔

۹ بجے داحدی صاحب۔ مولانا عارف ہسوی اور مولانا حسرت موہانی

ملاقات کو تشریف لائے۔ میرے کام اور تبلیغ کا ذکر ہوتا رہا۔ مولانا حسرت موہانی نے فرمایا "شدھی" اور تبلیغ کا جھگڑا نہ چھڑتا تو اچھا تھا۔ لیکن جب شروع ہو گیا ہے تو میں صفائی سے کہتا ہوں کہ پوری مستعدی سے مسلمانوں کے تحفظ اور اشاعتِ اسلام کا فرض ادا کیجیے۔

مولانا حسرت موہانی جانے لگے تو درویش خانے کے بڑے ہال میں "مرشد کو سجدہ تعظیم" نامی کتابیں رکھی تھیں۔ مولانا نے ایک کتاب اٹھائی اور کہا اس مسئلہ میں، میں آپ کا پورا ہم عقیدہ ہوں، عارف صاحب نے واحدی صاحب سے ہنس کر کہا۔ لیجئے۔ سنئے۔ مولانا کیا کہہ رہے ہیں۔ واحدی صاحب نے سنجیدگی سے مولانا حسرت موہانی کی طرف دیکھا۔ مولانا نے کہا ہاں۔ بے شک۔ بے شک میرا یہی عقیدہ ہے۔ میں مرشد کو سجدہ تعظیم ضروری سمجھتا ہوں۔

گاندھی جی کا اکیس روزہ برت

۱۸ ستمبر ۱۹۲۴ء سے مہاتما گاندھی نے مولانا محمد علی کے مکان واقعہ کوچہ چیلان میں مشہور اکیس روزہ برت شروع کیا۔ ۲۱ ستمبر کو خواجہ صاحب اُن سے ملنے گئے۔ پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی سے ملاقات ہوئی۔ پھر مہاتما جی نے خواجہ صاحب کو تنہا اپنے پاس بلایا۔ وہ پلنگ پر لیٹے تھے۔ چہرے پر تبسم تھا۔ بہت محبت سے پیش آئے۔ خواجہ صاحب نے حالت پوچھی۔ بولے ابھی تک تو اچھا ہوں۔ تھوڑی سی کمزوری ہے۔ خدا نے چاہا تو اکیس دن آسانی سے پورے ہو جائیں گے۔

خواجہ صاحب نے مہاتما جی کے برت پر اخبارات کو تار دیا تھا۔ مولانا محمد علی نے کمرے میں تشریف لا کر اُس کا مضمون مہاتما جی کو سُنایا۔ مہاتما جی سُن کر بولے بہت اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔

اتحاد کانفرنس

خواجہ صاحب ۲۶ ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں :-

"(مہاتما گاندھی کے اکیس روزہ برت کی وجہ سے) ہندو مسلم فساد کی نسبت سوچنے کے لئے تمام ہندوستان کے لیڈر جمع ہوئے ہیں مولانا محمد علی نے افتتاحی تقریر فرمائی اور مہاتما جی کا ذکر کرتے وقت رونے لگے۔ قرآن شریف کی آیات سے ثابت کیا کہ اسلام فتنہ وفساد کو کتنا ناپسند کرتا ہے۔ اُن کے بعد پنڈت موتی لال نہرو نے صدارتی تقریر کی۔ نہرو جی اس کانفرنس کے صدر ہیں۔"

۲۸ ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں :-

" ملاپ کانفرنس میں آج گائے کا مسئلہ پیش تھا۔ لالہ لاجپت رائے اور جے رام داس سندھی اور سوامی شردھانند نے ایسی سخت تقریریں کیں کہ مولانا محمد علی کو جوش میں آکر شکایت کرنی پڑی۔"

۳۰ ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:-

" (ملاپ کانفرنس ابھی جاری ہے) آریہ سماج والوں نے مجھ پر اپنے ایک سمن کی تعمیل کرائی ہے۔ وہ کسی آریہ مجرم کی صفائی میں میری شہادت دلوانی چاہتے ہیں۔ مقصد جرح کر کے دق کرنا ہے اور میرے کام کے متعلق سوالات کرنا اور مجھے کانفرنس سے علیحدہ کر لینا۔ وہ تجھ

بکھری گیا۔ آدمیوں کا ہجوم تھا۔ میں نے انگریز ڈپٹی کمشنر سے کانفرنس کی مصروفیت کا ذکر کیا۔ انھوں نے فوراً دو دن کی تاریخ دے دی میں جلسہ میں چلا آیا۔"

بہ ہزار دقت گائے کا مسئلہ ختم ہوا۔ کچھ ہندو دبے۔ کچھ مسلمانوں نے ایثار کیا۔ اس کے بعد مسجدوں کے آگے باجہ بجانے پر بہت گرما گرم مباحثہ رہا۔ آخر وہ بھی حسب منشا طے ہو گیا۔ پھر آرتی اور اذان کی باری آئی۔ اور وہ بخوش اسلوبی طے پائی۔"

آج مہاتما گاندھی کے برت کا تیرھواں دن تھا۔

۴ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"آج ملاپ کانفرنس میں بھیّا احسان نے تحریک پیش کی تھی کہ "شدھی" اور "تبلیغ" ایک سال کے لئے ملتوی کردی جائے تائید کے لئے میرا نام لکھا تھا۔ صدر جلسہ نے اپنی طرف سے اسے پیش کیا مگر حاضرین مباحثے کے لئے راضی نہ ہوئے۔ اس لئے تحریک واپس ہوگئی۔ بہرحال جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا"

۵ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

"صبح مہاتما گاندھی سے ملنے گیا۔ اگرچہ ڈاکٹروں نے ملاقات بند کر رکھی ہے۔ مگر مہاتما جی نے میری خبر سنی تو بلا لیا۔ چہرہ بہت مرجھا گیا ہے۔ اُن کی بیوی سر پر تیل مل رہی تھیں۔ حسب معمول ہنس کر باتیں کیں۔ کہنے لگے کہ آپ نے جلسے میں پوری توجہ سے حصہ لیا مجھے یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے کہا۔ میں چھوٹا آدمی ہوں۔ بڑے آدمیوں کی کوشش سے جلسہ کامیاب رہا۔ ہنس کر کہا۔ میں آپ کو

چھوٹا آدمی نہیں سمجھتا۔ پھر کہنے لگے۔ آپ کی دعا سے خدا نے روزے کے اٹھارہ دن گزروا دیئے، اب تین دن باقی ہیں۔"

عالم خیال میں فیروز شاہ تغلق سے باتیں

خان نعمت اللہ خاں، ڈسٹرکٹ جیل دلی کے کرتا دھرتا، جن کی ڈاڑھی کی سالگرہ کا قصہ پہلے لکھا جا چکا ہے، تبدیل ہو کر ملتان جا رہے تھے۔ خواجہ صاحب نے خان صاحب کو بڑی شاندار رخصتی پارٹی دلوائی۔ بیالیس ہندو مسلمان اور سکھوں کے دستخطوں سے دعوت نامہ جاری کیا اور تمام عمائدِ شہر کو بلایا۔ جنگل میں منگل کر دیا۔

یہ پارٹی کوٹلہ فیروز شاہ کے کھنڈرات میں دی گئی تھی۔ بقول میر محمد حسین تحصیلدار دلی، اس مقام پر ایسی رونق یا اُس وقت ہوئی ہوگی جب فیروز شاہ تغلق نے یہ قلعہ بنایا تھا یا خان نعمت اللہ کی پارٹی کے وقت ہوئی۔ خواجہ صاحب ۵، اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

"پارٹی سے فارغ ہو کر میں نے بھیا کے ہاں جانا چاہا تو سواری نہ ملی۔ حسین اور علی گھر سے آئے تھے وہ گھر جانے کی جلدی مچا رہے تھے (میں تو ملاپ کانفرنس کی وجہ سے بھیا کے ہاں مقیم ہوں) رات زیادہ ہوتی جاتی تھی، مگر سواری کا نام و نشان نہ تھا۔ میں بچوں کو لئے سڑک کے کنارے فرشِ خاک پر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھی اور بچے سواری کے انتظار میں تھے اور میں چھ سو برس کے پرانے قلعہ کے دامن میں خاک پر بیٹھا عالمِ تصور میں دیکھ رہا تھا کہ سلطان محمد تغلق کا جانشین فیروز شاہ تغلق اپنے دیوہیکل جسم کے ساتھ ننگی تلوار ہاتھ میں لئے گھوڑے پر سوار میرے سامنے کھڑا ہے اور مجھ سے پوچھتا ہے

اے او خاک نشین! دیکھ، میں نے یہ قلعہ کیسا بنایا، اور میری زبانِ حال اُسے جواب دیتی ہے کہ ہاں اے گھوڑے پہ سوار بادشاہ! تیرا قلعہ اچھا بنا ہے، مگر ذرا اُس کے سوال کا جواب بھی دے جس نے تیرے وجود کا قلعہ بنایا اور تجھے ہندوستان کی بادشاہت بخشی اور کروڑوں انسانوں کو جو اس ملک میں رہتے ہیں تیرا تابعدار کر دیا۔ سُن او خاک کے پُتلے! جب تیرے وجود کا قلعہ باقی نہ رہے گا تو تیرا بنایا ہوا قلعہ کیا باقی رہ سکتا ہے، تو اس سے خوش نہ ہو کہ تیرا قلعہ اچھا بنا ہے۔ اس سے خوش ہو کر تو مسلمان ہے اور تجھے اللہ کے اُن بندوں سے اعتقاد ہے جو اس دنیا کی شان و شوکت اور کرّ و فر کو چند روزہ اور بے حقیقت سمجھتے ہیں۔

او سلطان! یہ بھی دیکھ کر چھ سو برس بعد تیرے قلعہ کا کیا حال ہو جائے گا۔ پردہ ہٹ گیا۔ سُلطان نے مُڑ کر دیکھا۔ محل سرنگوں تھا۔ دروازوں کی محرابیں گری پڑی تھیں، اور کھنڈرات میں جنگلی جانور دوڑتے پھرتے تھے۔ سلطان ششدر رہ گیا اور میں نے کہا ؎

پردہ داری مے کند در قصرِ کسریٰ عنکبوت

بُوم نوبت مے زند بر گنبدِ افراسیاب

میں اس تصور میں تھا کہ غزالی تانگے کر آ گئے اور اُن کی آواز سے میں چونک پڑا۔ جس طرح عالمِ خیال کا نقشہ نابود ہو گیا۔ اسی طرح عالمِ مثال کا یہ رنگ بھی فنا ہو جائے گا۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔"

تانگے والے پر ایک نظر

"تانگے میں سواریاں زیادہ تھیں۔ تانگے والے نے کہا، کوئی سپاہی نہ ٹوکے۔ میں نے سوچا کہ تانگے والے کو بھی قانون کا ڈر ہے۔ کیا حال ہوگا اُن لوگوں کا جو اللہ کے قوانین کا لحاظ نہیں کرتے۔ مجھ سے تو یہ تانگے والا اچھا، جو قانون سے ڈرتا ہے اور جو اپنے گھوڑے کو اور اپنے تانگے کو اور اپنی سواریوں کو سڑک کے گڑھوں سے بچاتا ہے۔ اور راستے کے غافل مسافروں کو آواز سے پکارتا جاتا ہے کہ وہ جھپیٹ میں نہ آئیں۔ اس کی نظر اور اس کے ہاتھ اور اس کا دماغ سب گھوڑے کی لگام کی طرف متوجہ ہیں تاکہ گھوڑا سیدھا راستہ چلے۔ اسے سردی گرمی اور برسات کسی موسم میں اپنے جسم کی پرواہ نہیں ہوتی۔ راستہ چلنے والوں کی بدکلامیوں کو بھی سُنتا ہے، اسے گھوڑے کو چابک مارنے نہیں آتے۔ گھوڑے کے ساتھ محبت کرنی بھی آتی ہے۔ یہ اپنے پیچھے کے خطرے سے بھی ہوشیار رہتا ہے اور سامنے کے خطروں کو بھی دور سے دیکھ لیتا ہے اور دائیں بائیں کے خطرات بھی بھانپتا جاتا ہے۔ سنو بھائی غزالی! مجھ سے تانگے والا اچھا ہے جو اپنے فرض کا ہر پہلو سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو محتاط رکھتا ہے، کیا میں بھی اُن لوگوں کو جو میری رہنمائی کے تانگے میں سوار ہیں، اسی احتیاط، اسی خوف اور اسی ذمہ داری کے ساتھ راہِ راست پر لے جاتا ہوں۔ نہیں، اے نرگسیں چشم والے! میں اس تانگے والے سے ادنیٰ ہوں۔ تانگے کے پہیوں کی طرح میری زندگی کو رات دن کی گردش ختم کر رہی ہے۔ مگر پہیئے

منزل تک پہنچا دیتے ہیں اور شب و روز کی گردش مجھے منزل تک پہنچنے نہیں دیتی۔"

حق کی تلاش

۹ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں :۔

"ایک رنگین پوش درویش ملاقات کو آئے۔ علوم دین کی تکمیل کر چکے ہیں۔ اب فقیری کا شوق ہوا ہے۔ میں نے پوچھا کیا چاہتے ہو؟ بولے حق کی تلاش ہے۔ میں نے جواب دیا۔ باوردی پولیس کا آدمی تلاش میں بمشکل کامیاب ہوتا ہے بے وردی کا پولیس والا جلدی سراغ چلا لیتا ہے۔ حق کو تلاش کرنا ہے تو گیروا لباس اُتار ڈالو۔ اس سے بوئے ریا آتی ہے۔ کہنے لگے درویشی لباس آج کل بدنام ہے نفس کشی کے لئے پہنا ہے۔ میں نے کہا۔ اگر یہ بات ہے تو نیت کا بدلا اللہ دیگا۔"

دو دوستوں سے جدائی

لاکھوں آدمیوں کا ملنے والا کس کس کا دوست بن سکتا ہے۔ اور مسافر سے تو کوئی بھی پیت نہیں کرتا۔ مثل ہے کہ جوگی کسی کے میت نہیں ہوتے، مگر خواجہ صاحب دوستوں کے بڑے ہی اچھے دوست تھے۔ ملاحظہ کیجئے خان نعمت اللہ خاں کے دلی سے ملتان جانے پر خواجہ صاحب ۱ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں فراق نامہ لکھتے ہیں :۔

"آج نعمت اللہ خاں صاحب (جیلر) دلی سے ملتان جا رہے ہیں آج وہ شخص دلی سے رخصت ہو رہا ہے جو دو برس سے میری مجلسی

زندگی کا شریک تھا اور حسین کے دل میں باوجود جیل کا داروغہ ہونے کے سچی ہمدردی، محبت اور گدازگی تھی اور حسن کی صادقانہ اخلاصمندی مجھے اور سب دوستوں کو ہمیشہ یاد رہے گی۔

مجھ جیسے آدمی کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ کیونکہ ہم لوگوں کے ہر مقام پر سینکڑوں اور ہزاروں ملنے والے ہوتے ہیں۔ ہم اگر دوستیاں قائم کرنی شروع کر دیں تو ملک خدمت دشوار ہو جائے۔ اسی وجہ سے میں دوست کا لفظ بہت کم کسی کے واسطے استعمال کرتا ہوں صرف ملنے والا کہتا ہوں۔ مگر داروغہ نعمت اللہ خاں اور ملک سلطان محمود نے محض اپنے برتاؤ اور اپنی اخلاص شعاری کی قوت سے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اپنے ہرجائی پن کو محدود کر کے دونوں کو اپنا دوست سمجھوں۔

سرحدی باشندوں کے آتش فشاں مزاج اور دلی والوں کے شبنمی مزاج کا متحد ہونا بظاہر محال نظر آتا تھا، لیکن میں داروغہ جی اور ملک صاحب کی تعریف کروں گا۔ محض اُن کی خوبی تھی کہ اُنکی آتش مزاجی نے میرے شبنمی مزاج کو نباہ لیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ مجھ کو ان دونوں کی جُدائی سے اتنی اذیت ہوگی جتنی اذیت ریل کے روانہ ہونے کے بعد میرے قلب نے محسوس کی۔ اب میں کسی شخص سے اس قسم کے تعلقات قائم کرنے کی جرأت نہیں کروں گا۔ مجھے دنیا میں اور کام کے لئے بھیجا گیا ہے"۔

ملک سلطان محمود بھی حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی کے مُرید تھے اور اکثر دبیشتر خان نعمت اللہ ہی کے ساتھ رہا کرتے تھے، خان صاحب کے ہمزاد کہنا چاہیئے۔

جہاں خان نعمت اللہ خاں وہاں ملک سلطان محمود۔ ملک صاحب غالباً بہت آسودہ حال تھے۔ کمانے دھمانے کا انھیں فکر نہیں تھا۔

خواجہ صاحب نے تو لوچدار سرحدی اور بھی بہت دیکھے ہوں گے، لیکن مجھ گوشہ نشین کی نظر سے کم از کم ملک سلطان محمود جیسا لوچدار سرحدی اور نہیں گزرا۔ وہ نعمت اللہ خاں سے زیادہ لوچدار تھے۔

تاثرات

۱۳ ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں :۔

"آج کلکتہ سے عبد الغنی نظامی نے روحہ کے لئے ایک خوبصورت جوتی بھیجی تھی۔ جب پارسل روحہ کے نانا نے کھولا تو روحہ نے غیر معمولی خوشی کا اظہار کیا۔ میں اُس کے خوشی کے جوش اور اضطراب کو بغور دیکھتا رہا۔ یہی عمر دنیا کی اشیاء سے خوش ہونے کی ہے۔ اس کے بعد خوشی میں آمد نہیں رہتی۔ آورد آجاتی ہے۔

روحہ نے جوتی پہنی۔ جوتی پاؤں میں ذرا تنگ تھی۔ روحہ نے عجیب و غریب بات کہی کہ ابھی جوتی کو رکھ دو۔ میں چھوٹی ہو جاؤں گی۔ تو پاؤں میں ٹھیک آنے لگے گی۔

اگرچہ عمر کا اُلٹا پھرنا محال ہے، تاہم قدرت نے روحہ کی زبان سے مجھے بڑا گہرا سبق دیا۔ جس طرح عمر کا واپس جانا محال ہے اسی طرح زندگی کا دوامی قیام محال ہے۔ لیکن انسان اپنی زندگی کو کچھ غیر فانی سا خیال کرتا ہے اور ہر وقت حرص و ہوس میں مبتلا رہتا ہے۔"

مسٹر جارج برنارڈ شا کی جب کوئی شخص سوانحعمری لکھنی چاہتا تھا اور حالات

پوچھنے اُن کے پاس آتا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میری تصنیفات کیا سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ سوانح عمری کی ضرورت کیوں محسوس کی جا رہی ہے تصانیف سے اُن کے مصنف کا کردار بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔

میں برنارڈ شا کے خیال سے متفق ہوں اور اسی خیال کے پیشِ نظر خواجہ صاحب کے بکھرے ہوئے تاثرات چھانٹ کر نکال رہا ہوں۔ سوانح عمری کی وسعت اجازت نہیں دیتی ورنہ یہ اتنے نکل سکتے ہیں کہ تاثراتِ خواجہ حسن نظامیؒ کے نام سے الگ کتاب بن جائے آپ سوانح عمری خواجہ حسن نظامی میں انھیں سوانح عمری کا جزو ہی قرار دیکر پڑھیئے۔ چلتے ہوئے تاثرات مستقل تصانیف سے زیادہ انسان کی طبیعت اور طبیعت کے رجحانات کا پتہ دیتے ہیں۔ چلتے ہوئے تاثرات کا درجہ وہی ہے جو بے تکلف و بے تصنع خطوط کا ہوتا ہے۔

میں خواجہ صاحب کے تاثرات چھانٹ کر نکال ہی نہیں رہا ہوں نکال نکال کر چھانٹ بھی رہا ہوں۔ ایسے تاثرات چھوڑتا جاتا ہوں کہ

"نو بجے لیٹ گیا اور اچھی نیند شروع ہوئی۔ مگر گیارہ بجے بلیوں کی لڑائی سے آنکھ کھل گئی۔ اُٹھ کر بلیوں کو بھگایا۔ دروازے بند کئے۔ نیند پھر دو بجے تک نہ آئی۔ انگریزی حسن کی تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ آنکھیں بلی کی سی ہوں۔ تو بھائی! بلی بھی تکلیف دہ اور انگریزی حسن بھی ایذا دہندہ۔ مجھے دونوں سے پناہ مانگنی چاہیے"۔

میں سب تاثرات نہیں لے رہا۔ سب تاثرات جمع کرنے لگوں تو سوانح عمری بیحد بڑھ جائے۔

نیز ایسے تاثرات سے مجھے دلچسپی کم ہے کہ:۔

"شیخ مولا بخش صاحب نے مہاتما گاندھی سے یہ فقرہ خوب

کہا کہ اللہ ہم سے بھی راضی ہو اور آپ سے بھی راضی ہو۔ گویا
درپردہ اسلام کی تلقین و تبلیغ کی گئی۔"

اس نوع کے تاثرات بھی خواجہ صاحب کی طبیعت کے رنگوں میں کا ایک رنگ
دکھا سکتے ہیں، لیکن میرا قلم انھیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور اس نوع کے
معمولی معمولی تاثرات کو قبول کرنا چاہتا ہے کہ:۔

"دو گھنٹے سویا ہوں گا۔ درد سر اور ریزش کی کثرت سے آنکھ کھل گئی
دیکھا کہ غزالی بے غل و غش سو رہے ہیں۔ انھیں نیند کی نعمت میسر ہے
اور میں اس تکلیف میں مبتلا ہوں۔ مگر جو نعمتیں مجھے ملی ہیں وہ ان کو
نصیب نہیں ہیں۔ مجھے اللہ کا شکر کرنا چاہیئے۔ حرف شکایت زبان
پر نہیں لانا چاہیئے۔"

سنو میاں حسن نظامی! اگر تم آدمی ہو اور تمھیں زندہ رہنے کا شوق
ہے تو زندگی کے ہر دکھ سکھ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ لیٹو، یا بیٹھو
چھینکو یا ناک سنکو، ہائے، ہائے کرو یا چپ رہو۔ بیماری کا جتنا
وقت مقرر ہو گیا ہے وہ تو اپنی جگہ سے ٹلنے کا نہیں۔ اس لئے بہتر
یہی ہے کہ ہنسی خوشی یہ وقت گزار دو اور کام کئے جاؤ۔"

مگر معمولی تاثرات کی تعداد بے شمار ہے، قلم کا کہنا کیسے کر سکتا ہوں قلم
کو روکنا پڑتا ہے۔

خواجہ صاحب کی زندگی کا پہلا دور مرتب کرتے وقت اللہ ہی مددگار ہے۔
اللہ نے میرے بوڑھے حافظے کو جتنا جگایا اتنا میں نے لکھ دیا۔ دوسرے دور کے لئے
بفضلہ تعالیٰ خواجہ صاحب کا تیس سالہ روزنامچہ موجود ہے۔ روزنامچے سے واقعات
کے سرے ملتے جاتے ہیں اور واقعات بآسانی یاد آتے جاتے ہیں۔ ہر واقعہ

سامنے گزرا ہے۔

پہلا دور ایک سو بارہ صفحوں میں ختم ہو گیا۔ دوسرے دور کا ابھی گیارھواں مہینہ چل رہا ہے۔ انتیس سال باقی ہیں اور چھ ہتر صفحے لکھے جا چکے ہیں۔

خواجہ صاحب کا روزنامچہ

خواجہ صاحب کو روزنامچہ نویسی کا بچپن سے شوق تھا۔ لیکن روزنامچے کی مسلسل اور باضابطہ اشاعت ہفتہ وار رسالہ درویش سے شروع کی گئی تھی درویش میں نے اور منشی عبدالحمید (ایڈیٹر رسالہ مولوی) نے نکالا تھا۔ درویش کے زمانے کے روزنامچے مورخہ ۷ نومبر ۱۹۲۳ء میں خواجہ صاحب تحریر فرمائے ہیں

"دلی پہنچا۔ واحدی صاحب کے ہاں گیا۔ وہ کچھ علیل ہیں۔ رسالہ درویش کے دوسرے مالک منشی عبدالحمید صاحب بھی آ گئے۔ ان دونوں نے کہا۔ ۱۵ نومبر کے درویش کے لئے مضمون دیجئے اور روزنامچہ لکھیے کہ تمام ناظرین روزنامچہ زیادہ مانگتے ہیں۔

میں نے کہا تم دونوں میرے ایک سوال کا جواب دو، کہ آخر روزنامچے میں ایسی کیا بات ہے کہ ہر شخص اس کی تعریف کرتا ہے اور اسے مانگتا ہے۔ میں گھریلو باتیں اپنی یادداشت اور حساب عمر کے لئے لکھ لیا کرتا ہوں، لوگوں کو کیا حق ہے کہ وہ اس کو دیکھنے اور سننے کا تقاضہ کریں۔ میرا دل بعض اوقات ان باتوں کی اشاعت سے انکار کرتا ہے جو میری خانگی اور اندرونی ہیں۔ علاوہ ازیں مجھے تعجب اس پہ ہے کہ روزنامچے میں سوائے اس کے کہ مجھے نیند آئی یا نہ آئی۔ میں کھانسا۔ میں چھینکا۔ میں وہاں گیا۔ میں یہاں آیا

اور ہوتا کیا ہے جو لوگ اسے اتنی دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور اتنا اشتیاق ظاہر کرتے ہیں ——— واحدی صاحب نے کہا یہ میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ ناظرین اسے کیوں پسند کرتے ہیں۔ بظاہر اس میں کوئی بات پسندیدگی کی نہیں ہوتی۔ لیکن اتنا حال میں اپنا بھی جانتا ہوں کہ جب کاپیاں صحیح کرنے کے لئے میں درویش کے مضامین پڑھتا ہوں تو مجھے بھی روزنامچہ پڑھنے میں زیادہ لطف آتا ہے اور اس کے پڑھنے کے بعد تکان کی بجائے میں فرحت محسوس کرتا ہوں"

یہ خیال میرا ۱۹۲۴ء میں تھا کہ روزنامچے میں کوئی بات پسندیدگی کی نہیں نہیں ہوتی۔ مگر آج جبکہ میں روزنامچے سے کام لے رہا ہوں، روزنامچہ مجھے نہایت کام کی چیز نظر آتا ہے۔

دیکھیے ۰ ار نومبر کے روزنامچے میں کیسی کام کی بات لکھ گئے ہیں:-

"آج ضلع بستی سے ایک صاحب آئے اور کہنے لگے آپ کے بھائی کا خط لایا ہوں۔ میں حیران ہوا کہ میرا بھائی تو قبر میں ہے، یہ نئے بھائی کون ہیں۔ میں نے خط دیکھا۔ حکیم سید یوسف حسن نظامی لکھنے والے نے اپنا نام لکھا تھا۔ میں نے کہا۔ میرے بھائی ہوتے تو بیمار ہوتے، یہ تو حکیم ہیں۔

جو صاحب خط لائے تھے، ان سے پوچھا، تشریف آوری کا مقصد فرمائیے۔ بولے آپ کی زیارت کرنے آیا ہوں۔ میں نے کہا صاف صاف کہیے۔ دل کا منشا ظاہر کیجیے۔ بولے۔ اللہ کی یاد کرنی چاہتا ہوں۔ میں نے کہا۔ میں دنیادار آدمی ہوں بےکار رہ کر یاد الٰہی کرنی ہے تو کہیں اور جائیے۔ جب تک معاش کا بندوبست نہ ہو میرے

نزدیک اللہ کی یاد مشکل ہے۔"

گاندھی جی کی پرارتھنا کے وقت خواجہ صاحب کی موجودگی

۱۲ر نومبر ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں :-

"اس کے بعد مہاتما جی کے پاس گیا۔ وہ اپنی عبادت کے لئے تیار تھے۔ مجھ سے کہا آپ ہماری پرارتھنا میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ آپ کے خیال میں میری شرکت ناجائز نہ ہو تو میں خوشی سے موجود رہوں گا۔ میرا اور آپ سب کا خدا ایک ہی ہے اور آپ اُسی کی عبادت کرتے ہیں۔ روشنی گل کر دی گئی۔ مہاتما جی پلنگ پر بیٹھے رہے۔ سب ہندو نیچے جمع ہو گئے۔

پہلے مہادیو دیسائی صاحب نے سنسکرت زبان میں خدا کی حمد و ثنا شروع کی۔ اُس کے بعد مہاتما جی اور سب ہندو اسے دُہرانے لگے پھر ایک ستار بجانے والے نے ستار بجا کر بھجن گایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ تیرے نام کو تمام مخلوق رٹ رہی ہے، یہاں تک کہ کُنتی کے کُنو نے بھی اُسے رٹا۔ بھجن کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔ آخر میں راجہ رام۔ سیتا رام تین بار سب نے کہا اور عبادت ختم ہو گئی۔

پوری عبادت میں بیس منٹ لگے۔ میں خاموشی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ منظر پُر اثر تھا۔ خصوصاً تاریکی اور خاموشی کا اثر دل پر پڑ رہا تھا مگر اُس وقت یہ بھی پتہ چلا کہ مسلمانوں کی نماز کا طریقہ بہت ہی اعلیٰ ہے۔"

مہاتما گاندھی کے ہاتھ کا اُردو خط

۱۲ر نومبر کو خواجہ صاحب مہاتما گاندھی کے پاس حضرت سلطان نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رح کے عرس کا بلاوا دینے گئے تھے۔ ۲۰ر نومبر کو عرس کے دوسرے دن مہاتماجی نے خواجہ صاحب کے نام اُردو میں اپنے ہاتھ سے خط لکھا۔ جس کا مضمون یہ تھا:۔

"عرس کی شرکت کا ارادہ تو تھا مگر کمزوری کے سبب نہ آسکا۔ جتنی طاقت بدن میں ہے، اُس کو اسی کام میں خرچ کرنا چاہتا ہوں جو سامنے موجود ہے۔"

اپنے مضمون کے چوروں سے خواجہ صاحب کا خطاب

خواجہ صاحب ۲۹ر نومبر ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

"آج رسالہ دلکش میں اپنا ایک مضمون دیکھا جو غدر دہلی کے افسانوں میں شایع ہو چکا ہے۔ جن صاحب نے اس پر قبضہ جمایا ہے انھوں نے اپنی طرف سے ایک لفظ نہیں گھٹایا بڑھایا۔ پورا مضمون میرا بعینہٖ نقل کر دیا ہے۔ البتہ آخر میں نام اپنا لکھا ہے۔ ایڈیٹر صاحب دلکش نے ان لائق مضمون نگار کو "امیر الکلام" کا خطاب دیا ہے۔

ان کے امیر الکلام ہونے میں کیا شک ہے۔ بادشاہ اور امیر ڈاکہ زنی سے بادشاہ اور امیر بنا کرتے ہیں۔ مضمون نگار صاحب نے میری زندگی میں میرے مضمون پر جس دلیری سے ڈاکہ مارا ہے، وہ اُن کی امیری اور بادشاہی کی کھلی ہوئی دلیل ہے وہ بے شک و شبہ امیر الکلام ہیں۔

امیر الکلام صاحب اس ڈاکہ زنی کی مشق بڑھانی چاہیں تو میں انھیں اپنے سب مضامین کے پتے بتا دوں۔ کیونکہ میں نے اُن چوروں کو بھی جو اسی سال کے شروع میں میرے ہاں سے گھر کا سامان چرا کر لے گئے تھے اس قسم کی مفید اطلاعیں دی تھیں۔ نیز انھیں بتایا تھا کہ فلاں فلاں چیزیں اتنی اتنی قیمت کی ہیں۔ کم قیمت پر فروخت نہ کرنا یہاں تک میں نے لکھ دیا تھا کہ چھتریوں میں ایک چھتری ایسی ہے جو کھولتے وقت اُنگلی پکڑ لیتی ہے اُسے ذرا احتیاط سے کھولنا اُنگلی کہیں زخمی نہ ہو جائے۔

میرا یہ مضمون رسالہ درویش میں چھپا تھا۔ سُنا ہے چور اُسے پڑھ کر بہت ہنسے تھے۔ مگر میں اُن کی ہنسی کا خواستگار نہ تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ چوروں نے چوری کی ہے تو اُس سے کچھ حاصل کریں۔ چیزوں کو برباد نہ کریں۔

اسی طرح امیر الکلام صاحب سے درخواست ہے کہ میرے مضامین کو چُرا کر ایسی جگہ استعمال کریں جہاں سے فائدہ ہو۔

اندازِ گفتگو کے دو اور نمونے

سنبھل ضلع مراد آباد کے ایک مولوی صاحب تشریف لائے اور خواجہ صاحب سے فرمانے لگے۔ آپ کو سنبھل لے جانا چاہتا ہوں۔ خواجہ صاحب نے کہا "جناب کیوں؟"۔ بولے "وہاں کے باشندے آپ کے دیدار کے مشتاق ہیں" خواجہ صاحب نے کہا "کیا سنبھل والوں نے کبھی کسی دو آنکھوں والے اور دو کانوں والے اور ایک ناک اور ایک مُنہ والے اور دو ہاتھ، دو پاؤں والے، لمبے، دُبلے

سو کھے آدمی کو نہیں دیکھا جو میرے دیدار کے مشتاق ہیں" حاضرین ان باتوں پر ہنس پڑے مگر سنبھلی مولوی صاحب خاموش ہو گئے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "مولوی صاحب! آپ بُرا نہ مانیں۔ سردی ذرا گھٹ جائے۔ میں ایک دن کے لئے سنبھل ضرور آؤں گا اور اپنا جمالِ جہاں آرا اُن لوگوں کو دکھاؤں گا"

دوسرا نمونہ روزنامچے میں ابھی میرے سامنے نہیں آیا۔ ۱۹۲۴ء کے بعد کبھی آئے گا، لیکن روزنامچے کے انتظار کی کیا ضرورت ہے۔ مولانا حسن مثنیٰ پھلواروی ندوی نبیرہ حضرت مولانا شاہ سلیمان ؒ نے اسے روزنامچے ہی جیسے مزے سے اپنے ایک مضمون میں بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"خواجہ صاحب جتنے ذہین و فطین تھے اُتنے ہی جری و بے باک بھی تھے اور اُتنے ہی ماہرِ نفسیات بھی تھے۔ نازک سے نازک اور کٹھن سے کٹھن گھڑیوں میں بھی اُن کا دماغ اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بڑی اور گرانقدر چیز خواجہ صاحب کی وہ جراءت تھی جس کا دامن مقصدیت اور انسان دوستی سے بندھا ہوا تھا۔ صاحبِ تاج و اورنگ کے دربار میں کم ہی لوگ ہیں جنھوں نے جراءت و بے باکی سے کام لیا ہو اور اس جراءت و بے باکی میں اتنا ہی دلکش و دل آویز پیام بھی موجود ہو۔

خسرو دکن نواب میر عثمان علی خاں کے عہدِ عروج اور طمطراقِ شاہانہ کے قصے ابھی لوگ بھولے نہ ہوں گے۔ بڑے بڑوں کے سر اس بارگاہ بلند میں ادب و احترام سے جھک جاتے تھے۔ خواجہ صاحب حیدرآباد پہنچے تو حسبِ دستور "باریابی کی عزت بخشی گئی"۔ اور خواجہ صاحب بارگاہ خسروی میں "باریابی" کے لئے روانہ ہوئے، مگر ذرا دیر

دیر لگ گئی۔ اس دیر نے مزاجِ شاہی کو برہم کر دیا۔ خواجہ صاحب نے کہا:۔

"ظلِ سبحانی! جب میں اپنی قیام گاہ سے بارگاہ خسروی کی طرف چلا تو راستہ میں آواز پر آواز سنائی دی۔ حسن نظامی! حسن نظامی! کوئی پکار رہا تھا۔ مڑکے دیکھا تو چھڑکاؤ کی گاڑی تھی اور وہی پکار رہی تھی۔" یہ سن کر خسرو دکن کا غصّہ اور بھڑکا۔ لیکن خواجہ صاحب نے نہایت متانت اور صبر و سکون کے ساتھ فرمایا۔" ہاں ظلِ سبحانی! چھڑکاؤ کی گاڑی مجھے پکار رہی تھی۔ اور اس نے کہا۔ حسن نظامی! تو بادشاہ کی بارگاہ عالی میں جا رہا ہے۔ ایک بات میری بھی سنتا جا۔ اور میں اس کی بات سننے کو رک گیا۔ اس نے کہا۔ میں چھڑکاؤ کی گاڑی ہوں۔ صبح سویرے، منہ اندھیرے نل کے پاس جاتی ہوں وہ اپنی دولت سے میرا دامن بھر دیتا ہے۔ سڑک پر کروڑوں ذرات دھوپ میں پڑے پیاس پیاس پکارتے ہیں۔ اور میں اس دولت سے ان کی پیاس بجھاتی پھرتی ہوں۔ جب کہ میرا دامن خالی ہو جاتا اور میں پھر نل کے پاس جا کھڑی ہوتی ہوں اور وہ پھر اپنی دولت سے مجھے مالا مال کر دیتا ہے اور میں پھر پیاسے ذرات کی طرف دوڑتی ہوں۔ صبح سے شام تک یہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ میں اپنا دامن خالی کرتی جاتی ہوں اور نل میرا دامن بھرتا جاتا ہے۔ شام کو میں دامن خالی کر کے ہلکی پھلکی ہو کر آرام سے سو جاتی ہوں۔ صبح اٹھ کر پھر یہی کام شروع ہو جاتا ہے۔ حسن نظامی! تو بادشاہ کے پاس جا رہا ہے۔ تجھے بادشاہ نے بلایا ہے، نوازا ہے تو ایک پیام میرا بھی لیتا جا۔ بادشاہ سے کہیو کہ بادشاہ چھڑکاؤ کی

گارڈ ہوتے ہیں، اور اُن کی رعایا، یہ ساری مخلوق پیاسے ذرات ہیں۔"
نظام یہ سُن کر چونکے۔ ایسی باتیں انھوں نے کبھی کاہے کو سُنی ہوں گی۔ بادشاہوں کے دربار میں ایسی باتیں کہنے والا کہاں ہوتا ہے، اُن کا غصّہ دھیما پڑ گیا اور گفتگو کی دل آویزی نے اُن پر اثر کیا۔ انھوں نے پوچھا پھر کیا ہوا؟ خواجہ صاحب نے فرمایا:۔
ظلِّ سُبحانی! میں پھر گارڈ کی گارڈی کی باتیں سُن کر آگے بڑھا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ پھر آواز سُنائی دی۔ حسن نظامی! حسن نظامی! پھر کوئی پکار رہا تھا۔ مُڑ کر دیکھا تو لیٹر بکس تھا۔"
لیٹر بکس؟ نظام پھر چکرائے اور بولے اچھا اُس نے کیا کہا؟
اُن کا غصہ ابھی پوری طرح فرو نہیں ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا! — "ظلِّ سبحانی! وہی عرض کر رہا ہوں۔ لیٹر بکس نے کہا۔ حسن نظامی! تو بادشاہ کے ہاں جا رہا ہے۔ وہاں جانے سے پہلے میری بات سُنتا جا۔ میں لیٹر بکس ہوں۔ دن رات ایک طرح کھڑا رہتا ہوں۔ آنے والے لیک کر آتے ہیں۔ ان میں۔ عورت مرد بوڑھے۔ جوان۔ باپ بیٹے۔ بھائی بہن۔ میاں بیوی۔ عاشق معشوق، امیر، غریب۔ گورے۔ کالے بھی ہوتے ہیں۔ سب آتے ہیں اور مجھ پر اعتماد کر کے اپنی اپنی امانتیں اپنے سینوں سے نکال نکال کر میرے سینے میں ڈال جاتے ہیں۔ میں جاڑوں میں ٹھٹھرتا ہوں، گرمیوں میں تپتا جھلستا ہوں۔ برسات میں بھیگتا ہوں مگر کسی کی امانت ضائع نہیں ہونے دیتا۔ سب کی امانتوں کو سینے سے لگائے رکھتا ہوں اور چھپائے رکھتا ہوں اور ساری امانتیں اُن تک پہنچاتا ہوں جن کے

حقے کی ہوتی ہیں۔ حسن نظامی! تو بادشاہ کے ہاں جا رہا ہے، تو میرا یہ پیغام بھی لیتا جا۔ بادشاہ سے کہیو۔ بادشاہ بیٹر بکس ہیں۔ سب کی امانتوں کے امین۔ سب کے معتمد علیہ اور سب کی امانتوں کو صحیح جگہ پہنچانے والے، بس ظلِ سبحانی! ان باتوں کی وجہ سے بارگاہِ خسروی تک پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ ورنہ حسن نظامی ٹھیک وقت پر پہنچتا۔"

نظام جھوم اٹھے اور بہت خوب۔ بہت خوب کے نعرے لگانے لگے۔ یہ واقعہ خواجہ صاحب نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے۔ اُن کے بیان و زبان میں جو کیف اور اثر ہوتا تھا اُسے چھوڑیئے۔ یہاں اس واقعہ کا خلاصہ جس روکھے پھیکے انداز میں میں نے درج کیا ہے۔ اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا کہ چند سیدھے سادے جملوں میں خواجہ صاحب نے کیا کچھ نہیں کہہ دیا یہی بات اگر کوئی دوسرا کہتا — اول تو دوسرا اس طرح کی جرأت ہی نہ کرتا اور جو کرتا بھی تو خواجہ صاحب کا انداز بیان کہاں سے لاتا۔ یہ البیلا پن، یہ سحر اور یہ جادو، اس کی زبان میں کیسے آتا۔"

نخرہائے معدے کو تنبیہہ

خواجہ صاحب ۱۹ ر دسمبر ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

"آج میں نے ارادہ کیا کہ تین وقت کھانا کھایا کروں گا۔ رات کو کھانا نہ کھانے سے کمزوری بہت بڑھ گئی ہے، مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا دو وقت کا کھانا بھی ہضم نہ ہو سکا۔

یورپ کہتا ہے، آدمی دنیا میں کھانے کے لئے آیا ہے۔ میرا معدہ کہتا ہے۔ میں دنیا میں نخرے کرنے آیا ہوں۔

میں نے معدے سے کہا۔ تو میرے جسم کا نوکر ہے۔ جو چیز تجھے دی جائے

اُسے ہضم کر۔ مگر تو بڑا کام چور ہے۔ معدے نے جواب دیا :۔
"میں بغیر دماغ کی امداد کے ہضم کا کام پورا نہیں کر سکتا آپ ایک منٹ بھی تو دماغ کو میری طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں دیتے۔ کھانا کھانے کے بعد دماغ کو گھنٹہ بھر آرام دے دیا کیجیے میں پھر ہضم کا کام پورا کر دیا کروں گا۔"
میں نے کہا، دماغ میرے کہنے میں کہاں ہے کمبل کو میں تو چھوڑ دوں، لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ میں اگر دماغ کو چھٹی دے بھی دوں تب بھی وہ خیالی پلاؤ پکاتا رہتا ہے اور پتیلی میں اس زور سے کفگیر مارتا ہے کہ میں اُس کی آوازوں سے گھبرا کر مجبوراً کوئی کام اُسے دے دیتا ہوں۔
خیر میاں معدے! تم ہضم کرو یا نہ کرو، جب تک زندگی باقی ہے، زندگی کا چرخہ یونہی چلتا رہے گا۔"

روشنی کی موت

خواجہ صاحب ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو روزنامچے میں لکھتے ہیں :۔
"۵ بجے آنکھ کھلی تو لیمپ دم توڑ رہا تھا۔ تیل ختم ہونے کے بعد چراغ کیونکر گل ہوتا ہے۔ روشنی سکرات میں تھی اور لرز رہی تھی۔ اس میں سے خُر خُر، خُر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نہیں جانتا کہ روشنی مر رہی تھی یا بتی مر رہی تھی۔ بہر حال کسی نہ کسی کی موت کا وقت تھا میں اپنے تمام خیالات کو جمع کر کے لیمپ کی طرف دیکھنے لگا۔ نہیں میں نے خیالات کو جمع نہیں کیا۔ وہ خود ہی جمع ہو گئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ

ذرا غور سے دیکھیوں مرا کرتے ہیں۔ لیمپ نے ایک آخری تیز شعلے کی چمک دکھائی اور گل ہو گیا۔

کمرے کی تاریکی اور روشنی کی موت نے میری خودی کو گم کر دیا۔ اُسی وقت زنانہ مکان کا دروازہ کھلا۔ خواجہ بانو اُبلے ہوئے انڈے لیکر آئیں اور کمرے میں تاریکی دیکھ کر بولیں۔ ہیں! یہاں تو اندھیرا ہے میں نے کہا۔ اندھیرا کہاں نہیں ہے۔ روشنی تو ہر جگہ عارضی ہے وہ ذات تو اندھیرے میں پوشیدہ ہے۔ میں نے ابھی روشنی کا مرنا اور تاریکی کا زندہ ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھا جب روشنی مر رہی تھی اور تاریکی اُسے مار رہی تھی تو حُر، حُر، حُر، کی آوازیں آرہی تھیں۔ یا تو تاریکی اپنی حریت اور آزادی کا نعرہ لگاتی تھی۔ اور یا روشنی اپنی موت کو حریت اور آزادی کہتی ہوئی لیمپ سے جُدا ہو رہی تھی۔ مجھ دوسری روشنی لائے۔ میں نے وضو کر کے انڈے کھائے اور روشنی کی موت کا واقعہ خواب و خیال ہو گیا۔"

دادی سے باتیں

خواجہ صاحب کی ایک ممانی تھیں۔ خواجہ بانو کی وہ دادی ہوتی تھیں اور خواجہ صاحب بھی اُنھیں ممانی کی بجائے دادی کہا کرتے تھے۔

خواجہ صاحب ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

"شام کے پانچ بجے تک مسلسل کام کیا۔ صبح کے پانچ بجے سے شام کے پانچ بجے تک بارہ گھنٹے ہوتے ہیں۔ دماغ چیخ اُٹھا اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ ہاتھ جوڑ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ خدا کے

واسطے کام ختم کیجیے۔ اب مجھ میں ذرا بھی دم نہیں ہے۔ میں نے کام
بند کر دیا اور زنانہ مکان میں گیا۔ بڑی بیگم۔ حور بانو اور خواجہ بانو سے
باتیں کیں۔ پھر باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ سب عورتیں
وہیں جمع ہو گئیں۔ دادی روٹی پکا رہی تھیں۔ کہنے لگیں۔ تیرے بڑے
بیٹے کا مزاج بالکل تجھ جیسا ہے۔ جب تو اتنی عمر کا تھا تو تیرا مزاج بھی
ایسا ہی تیز تھا۔ میں نے کہا اس کا کیا ثبوت کہ تم نے مجھے اس عمر میں
دیکھا تھا۔ بگڑ کر بولیں۔ میرے سفید بال۔ میری سفید بھنویں۔
میری سفید پلکیں۔ میں نے کہا اگر میں یہ کہوں کہ جب میرے مرحوم دادا
تم سے شادی کرنے تمہارے گھر گئے تھے تو تم بہت چھوٹی سی تھیں
اور چھت پر چڑھی اپنے دولہا کی برات دیکھ رہی تھیں تو بتاؤ میری
عمر تم سے بڑھ جائے گی یا نہیں؟ سب عورتیں ہنسنے لگیں۔ دادی
نے بھولپن سے پوچھا، اچھا بتا۔ تیری عمر میری شادی کے وقت کتنی
تھی؟۔ میں نے کہا اتنی تھی کہ جب میں پیدا ہوا تو اسی مہینے تمہارے
ہاں لڑکی ہوئی تھی۔ دادی نے خواجہ بانو سے کہا۔ بوا ذرا حساب
لگانا یہ کے برس کا ہوا۔ اس پر پھر ایک فرمائشی قہقہہ لگا اور میں
کھانا کھا کر ایمان خانہ میں آگیا۔

چہل خواجہ صاحب آریوں سے بھی کرتے تھے

خواجہ صاحب کو خود قہقہہ لگاتے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کے بے تکلف
ملنے والے بھی ان کے سامنے قہقہے نہیں لگاتے تھے۔ ان کی مجلس پر وقار ہوتی تھی
لیکن پژمردہ نہیں ہوتی تھی بشگفتہ ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب بغیر مسکرائے اپنے فقروں

سے مجلس میں شگفتگی باقی رکھتے تھے۔ بولنے میں بھی یہی حال تھا اور لکھنے میں بھی یہی حال تھا۔ حتے کہ آریوں اور آریوں کی تحریک "شدھی" کا ذکر کرتے وقت بھی طبیعت کا یہ حال نہیں بدلتا تھا۔ ۲۴ر دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

"میرٹھ سے ایک رسالہ میرے خلاف شائع ہوا ہے۔ اس کے آخری صفحہ پر اشتہار دیکھا "برہمن اور خواجہ صاحب" قیمت ایک پیسہ "چھتری اور خواجہ صاحب" قیمت ایک پیسہ "ویش اور خواجہ صاحب" قیمت ایک پیسہ "شودر اور خواجہ صاحب قیمت ایک پیسہ "آریہ سماج اور خواجہ صاحب" قیمت ایک پیسہ۔ "شودیالک اور خواجہ صاحب قیمت ایک پیسہ "سکھ دھرم اور خواجہ صاحب" قیمت ایک پیسہ۔ خواجہ صاحب کو اللہ زندہ سلامت رکھے۔ ہردے پرکاش صاحب کو اُن کے طفیل سات پیسے ان کتابوں کی بکری سے مل جائیں گے۔ میری عین خوشی ہے کہ ان جیسے لوگ مجھے گالیاں دے کر روٹی کمائیں لیکن مسلمانوں کو غور کرنا چاہیے کہ آریہ سماج کے ادنیٰ ادنیٰ آدمی کس مستعدی سے کام کر رہے ہیں"۔

دو بچوں کا دلچسپ تذکرہ

خواجہ صاحب ۲۹ر دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:۔

"آج حسین کو ابن عربی کی شادی کی تقریبات دیکھنے کے لئے خواجہ بانو نے زنانہ مکان میں بلایا۔ مگر وہ اندر نہ گیا۔ اور کہا۔ عورتوں میں بیٹھنے سے آدمی عورت بن جاتا ہے۔ میں نے سمجھایا کہ یہ ضد فضول ہے چلے جاؤ۔ تمہاری امی خوش ہو جائیں گی کہ حسین میرے بھائی

کی شادی میں شریک ہوا لیکن وہ نہ مانا۔ میں نے خیال کیا کہ زیادہ اصرار اس کی قوتِ استقلال کو کم کر دیگا۔

میں بچپن میں ضدی نہیں تھا، تب ہی تو غیر مستقل مزاج ہوں خیر دیکھوں گا کہ میاں حسین عورتوں سے کب تک بیزار رہتے ہیں۔ اگر ان کی جوانی تک میں زندہ رہا تو میرے بڑھاپے کی انتہا ہوگی۔ گردن ہلنے لگے گی۔ کمر کبڑی ہو جائے گی۔ منہ میں دانت نہ رہیں گے اور میں ایک جگہ بیٹھا بیٹھا حسین کو آواز دوں گا۔ گھر والے کہیں گے۔ اس وقت وہ بیوی کے پاس ہیں اور کہتے ہیں۔ باوا جان سے کہہ دو۔ دو گھنٹے بعد حاضر ہوں گا۔ میں کہوں گا۔ کیوں بھائی! تو وہی حسین ہے جو عورتوں سے گھبراتا تھا اور زنانہ مکان میں نہ جاتا تھا۔ عمر اور حالات انسان کے مزاج میں بڑا تغیر کر دیتے ہیں۔ انسان کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ میں ہمیشہ یکساں رہوں گا۔

آج رات کو روحہ بھی دس بجے تک میرے پاس رہی۔ اس کی باتیں مجھے اُس وقت تک اچھی معلوم ہوتی ہیں جب تک وہ ناسمجھ ہے سمجھ دار ہونے کے بعد اُس کی باتوں کی قدر نہیں رہے گی۔ اللہ کے دربار میں بھی اُن کی قدر ہے جو عقل و دانش سے دست بردار ہو کر اُس کی آغوش میں جا گرتے ہیں۔ باقی جو ہوشمندی کے مدعی ہیں وہ مقبول ہو جائیں تو ہو جائیں۔ محبوب نہیں ہوتے۔

(حسین ۱۹۲۴ء میں سات برس کے تھے اور روحہ تین برس کی۔)

سنہ ۱۹۲۴ء ختم ہوتا ہے

۳۱ر دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء کا روزنامچہ میرے پیش نظر ہے۔ اب کل سے سنہ ۱۹۲۵ء ہوگا اور سنہ ۱۹۲۵ء کی باتیں۔ چلتے چلتے دو چار سطریں ۱۹۲۴ کی اور سن لیجیے۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"ایک دن ایک ہندو طوائف جو نعت گانے میں مشہور ہے، میرے ہاں بیٹھی تھی کہ ایک غیر مقلد مولانا صاحب تشریف لے آئے اور طوائف کو دیکھ کر اُنھوں نے زور سے لاحول پڑھی۔ طوائف کو اپنے گناہوں کا احساس ہوا۔ وہ رو پڑی۔ مجھ پر اُس کے رونے سے وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں نے اُس سے کہا:۔

اری سُن! میرا اور تیرا تو ایک حال ہے۔ تو بھی لوگوں کو لوٹنے کے لئے بناوٹی کپڑے اور زیور پہنکر فریب کی شکل بناتی ہے اور میں بھی پرہیز گار مشہور ہونے کے لئے ڈاڑھی اور سر کے بال بڑھاتا ہوں اور لمبا کُرتا پہنتا ہوں۔ تو بھی محفل میں ناچتی ہے۔ میں بھی قوالی میں رقص کرتا ہوں۔ مگر تو روتی ہے۔ کیونکہ تجھکو اپنے گناہوں کا احساس ہے اور میری آنکھوں میں آنسو نہیں آتا کہ میں اپنی ریاکاری سے غافل ہوں"۔

۳۱ر دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء کو دلی میں سخت سردی تھی۔ سردی کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں:۔

"اس کالی گھٹا اور اس اندھیری رات میں یہ سردی کیا کہتی ہے سردی کا کہنا سب سے الگ لگ ہے کسی سے کہتی ہے ؎

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند جو گنہ کیجیے ثواب ہے آج

کسی سے کہتی ہے یکسوئی سے عبادت کرنے کا یہی وقت ہے۔ مگر
مجھ سے تو کہہ رہی ہے کہ لحاف اوڑھ کر لیٹ جا اور تصوّر میں اُس
جانِ جہاں کا دھیان جما جو ہر تاریکی اور ہر روشنی اور ہر پھول اور
ہر کانٹے اور ہر مجنوں اور ہر لیلےٰ اور ہر آہِ دردمند اور ہر غمزۂ ناز کا مظہرِ اصلی
ہے۔ کیا میں کہہ دوں کہ آج رات کو میرے تصوّر میں وہی جانِ عالم
تھا اور اُس نے اپنے تصوّر میں جو لطف مجھے دیا۔ اُسے بس میرا دل ہی
جانتا ہے۔ نیند اگر نہیں آئی تو نہ آئے۔ جسم اگر کوفت کی شکایت کرتا رہا
تو کرتا رہے، میرے تصوّر نے جو نعمت حاصل کی وہ ان سب سے اعلیٰ ہے۔"

حضرت خواجہ صاحب کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست

حضرت خواجہ صاحب کی تصنیفات و تالیفات کا شمار پانچ سو سے زیادہ کیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے انقلاب ۱۹۴۷ء میں ان کتابوں کا فائل ضائع ہوگیا۔ وقتاً فوقتاً جو فہرستیں چھپتی رہتی تھیں وہ نامکمل ہوتی تھیں۔ کیونکہ ان فہرستوں کا مقصد تجارت ہوتا تھا اور ان ہی کتابوں کے نام درج کیے جاتے تھے جو اسٹاک میں موجود ہوں۔

سوانح عمری لکھتے وقت محترم واحدی صاحب نے مجھ سے کتابوں کی مکمل فہرست مانگی تو میں فراہم نہ کر سکا۔ چند پرانی شائع شدہ فہرستوں اور حافظے کی مدد سے جن کتابوں کے نام مل سکے وہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ دوسری جلد کی اشاعت کے وقت خدا نے چاہا اس فہرست کو زیادہ سے زیادہ مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی، اس سلسلے میں ناظرین کے تعاون کی بہت ضرورت ہے۔ اگر کسی کے پاس مندرجہ ذیل کتابوں کے علاوہ حضرت خواجہ صاحب کی کوئی کتاب ہو یا ان کو اس کا نام معلوم ہو تو براہ کرم مطلع فرمائیں۔

ذیل میں جو فہرست درج کی جارہی ہے، اس میں کسی خاص ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے — حسن ثانی نظامی

ترتیلی ترجمہ قرآن مجید	ظہور امام مہدیؑ
عام فہم تفسیر قرآن	شیخ سنوسی
سیاسی تفسیر	تین پر ایک
ہندی ترجمہ قرآن مجید	ناگفتہ بہ
تعلیم القرآن	پروفیسر کیرو کی پیشین گوئیاں
قرآن کا آسان دین	اردو دعائیں۔
قرآنی بول چال	اسلامی توحید
قرآن کے فرمان	اسکول کی دعائیں
حدیث کے فرمان	اچھا قاعدہ
تشریح بخاری	آسان سبق
اسرار کلام اللہ و اسم اعظم	اُردو سبق
اسلام کے ضروری عقائد	قرآن آسان
تاکید نماز	سترہ سورہ
روزے کے احکام	گیارہ سوہ
زکات کے احکام	ترغیب حساب
خدائی انکم ٹیکس	اتالیق خطوط نویسی
تفسیر جہانگیر	بیوی کی تعلیم
تہجد کی مناجات	بیوی کی تربیت
حدیث کی پیشین گوئیاں	اولاد کی شادی

اولاد کے کان میں کہنے کی باتیں
تعلیم اسرار تصوف
ہندو مذہب کی معلومات
فلسفۂ شہادت
حق پرستوں پر ستم
فاطمی دعوت اسلام
میلاد نامہ
محرم نامہ
یزید نامہ
طمانچہ بر خسار یزید
گیارھویں نامہ
تاریخ سلاطین عباسیہ
تاریخ مسیح
تاریخ فرعون
ہندو مسلمانوں کی آخری لڑائی۔
محمد گیان
ترک قربانی گاؤ
آواز
ایک بات
سادھو سنکٹ
گاندھی نامہ
تبلیغی مرثیے
تبلیغی عید کارڈ
بلاوا
ہندوستان میں اسلام کیونکر پھیلا
حلال خور
غازی مرقع
غزنوی جہاد
محمودی حملوں کے اسباب
تاریخ بہمنی
آپ بیتی
مفلسی کا مجرب علاج
مرشد کو سجدۂ تعظیم
تسخیر مہر و قہر
سفرنامہ مصر و شام و حجاز
سفرنامہ افغانستان
سفرنامہ ہندوستان
سفرنامہ پاکستان
کانا باتی
ایڈورڈ ڈائری
کائنات بیتی
جگ بیتی کہانیاں
کتاب تسلی

اردو کمپو
لڑائی کا گھر
آسمانی کہانی
بیگمات کے آنسو
انگریزوں کے قصے
محاصرہ دہلی کے خطوط
بہادر شاہ کا مقدمہ
غدر کے فرمان
غدر کے اخبار
غالب کا روزنامچہ
دہلی کی جانکنی
بہادر شاہ کا روزنامچہ
غدر کی صبح و شام
دِلّی کی سزا
سر طامس مٹکاف کی ڈائری
بچوں کی کہانیاں
نظامی بنسری
تذکرہ امیر خسروؒ
تمباکو نامہ
روزنامچہ ۱۹۲۴ء
قبروں کے غیبی نوشتے
تہذیب کی بوتل کا کاک

موت کا علاج
لاہوتی آپ بیتی
خط و کتابت
آٹھویں امام کا طبی پروگرام
طب کی تاریخ
روٹی سالن
نوکری
شیطان کا طوطا
پریم سنگم
شامی جہاد
سیرت نبویؐ
سی پارہ دل
چٹکیاں گدگدیاں
کرشن بیتی
فرام قنبلہ ٹو شملہ
کم ٹو موت
سیر دہلی
تسکین احساس
قوانین قرآن
چالیس آیت
حضرت امام حسینؓ کا موڈرن کیریکٹر۔
جہاں گیر کا روزنامچہ

تصوف کا خادم مشائخ کا محسن

حضرت مولانا شاہ غلام حسنین صاحب قبلہ مدظلہٗ سجادہ نشین خانقاہ سلیمانیہ پھلواری

کہتے ہیں کہ سیّد القوم خادمہم۔ یعنی قوم کا سردار خادم قوم ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ قوم کا خادم قوم کا سردار ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ حضرت خواجہ حسن نظامی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک صوفی کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ انھوں نے صوفیت یا تصوف کی کیا خدمت کی ہے۔ صوفی وہی ہو سکتا ہے جسے تصوف کی لگن ہو اور جسے تصوف کی لگن ہوگی، وہی تصوف کی خدمت بھی کرے گا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ لگن ہو جمہوریت کی اور خدمت ہو آمریت کی۔ یا خدمت ہو ڈیماکریسی کی اور لگن رکھی جائے ڈکٹیٹرشپ کی۔ غرض تصوف کی خدمت ہی سے پتہ چلتا ہے تصوف کی لگن کا، اور اس لگن ہی سے پتہ چلتا ہے صوفی ہونے کا۔

حضرت خواجہ صاحبؒ کی خدمات تو زندگی کے بے شمار گوشوں میں موجود ہیں انھوں نے خدمت کی مشائخ کی، علم و ادب کی، فن کسب حلال کی، فن اردو یہ سازی کی، فن تجارت کی۔ فن تبلیغ کی۔ قوم کی، ملک کی، اپنی، اپنی اولاد کی، اپنے خاندان کی، غریبوں کی، زندگی کے بہت سے گوشوں کی، لیکن ان کی ساری خدمات کا مرکزی نقطہ تصوف ہی کی خدمت تھا۔ میرے علم میں کوئی شیخ طریقت ایسا نہیں ہے، جس نے تصوف کے دفاع (ڈیفنس) میں اتنی سعی بلیغ اور ایسی منظم کوشش کی

ہو جتنی خواجہ صاحب نے کی ہے اور عمر بھر کرتے رہے۔ تصوف کی حمایت میں وہ چوکھیا جنگ کرتے رہے، صرف چوکھیا جنگ ہی نہیں، چوکھیا صلح بھی کرتے رہے۔ وہ لڑتے رہے منکرین اولیاء سے، آریوں سے، غیر مسلموں سے، اور دوسری طرف اپنا مرید بنایا مسلمانوں کو، ہندوؤں کو، عیسائیوں کو، اور سکھوں کو۔ اُن کی صلح کُل بھی تصوف کی خدمت کے لئے تھی، اور ان کی جنگ کُل بھی تصوف ہی کی خدمت کے لئے تھی۔

انھوں نے حلقہ قائم کیا تو وہ تھا "حلقۃ المشائخ" اور اس کا آرگن "نظام المشائخ" دوا بنائی تو "فقیر کی جھکی" کتاب لکھی تو "دعائے حزب البحر"۔ ٹوپی بنائی تو "ستر العرش" گھر بنایا تو "رین بسیرا"۔ پارٹی قائم کی تو "چشتی پارٹی"۔ بک ڈپو قائم کیا تو "خواجہ بک ڈپو" (یہ "خواجہ" اپنی رعایت سے نہ تھا، خواجہ خواجگان کی رعایت سے تھا۔) غرض زندگی کے جس جس خانے میں گھس سکتے تھے، گھسے، جنگ کر کے بھی گھسے اور صلح کر کے بھی گھسے، اور جہاں گئے، جدھر گئے، جس راستے گئے، جس بھیس میں گئے، تصوف کی اقدار ساتھ لیتے ہوئے گئے۔ عالموں میں عالمانہ لباس کے ساتھ گئے، مجمع مشائخ میں شیخ بنکر گئے، مسجدوں میں نمازی بن کر گئے، مندروں میں سادھو بن کر گئے۔ تاجروں میں تاجر ادیبوں میں ادیب، مصنفوں میں مصنف، درویشوں میں درویش، عالموں میں اہل علم سیاستدانوں میں اہل سیاست، میدان مناظرہ میں مناظر، بدمستان نشۂ دولت میں سب سے زیادہ خوددار، غریبوں میں ہمہ تن تواضع وانکسار، وہ ہر رنگ میں رہے لیکن اپنا رنگ، وہی خدمت تصوف کا رنگ ہر جگہ غالب رکھا ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

لڑنے میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے نہ دبے، جس سے لڑے جم کر لڑے۔ ہر رنگ سے لڑے، لیکن کس کے لیے؟ صرف تصوف کو بلند رکھنے کے لیے۔ اسکا

ثبوت؟ سب سے بڑا ثبوت لیجیے۔ وہ سب سے لڑے، لیکن نہ لڑے تو کسی مشائخ سے۔ مجھے علم ہے کہ بعض تنگ دل مشائخ، جناب خواجہ صاحبؒ کے سخت مخالف تھے، انھیں نیکی سے یاد نہ کرتے تھے، خواجہ صاحب یہ سب کچھ جانتے تھے، اچھی طرح جانتے تھے، لیکن قسم لے لیجیے جو انھوں نے کبھی جوابی حملہ کیا ہو۔ جوابی حملہ تو بڑی بات ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اُن کو خیر سے یاد کیا۔ تقویت دی، اُچھالا، نام روشن کیا۔ خواجہ صاحب کو اس طرزِ عمل سے کیا نفع تھا؟ اس سے کونسی غرض وابستہ تھی؟ بس، صرف اتنی بھر دلچسپی تھی کہ کچھ بھی ہو، ہیں تو یہ بزرگوں کے نام لیوا، کہلاتے تو ہیں، مشائخ، صورت تو ہے صوفیوں کی۔ اس لیے ان کی رسوائی عین ہماری رسوائی۔ اور طبقۂ مشائخ کی رسوائی ہے۔ جتنا بھر وہ یہ سمجھتے تھے کہ میرا اعزاز مشائخوں کا اعزاز ہے۔ اس سے زیادہ وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ مشائخوں ہی کی آبرو سے میری آبرو بھی قائم ہے۔

انھوں نے غور و فکر سے کام لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ مشائخوں اور پیرزادوں کی زبوں حالی اور گراوٹ کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک بے علمی اور دوسرے بے روزگاری۔ ان دونوں کمزوریوں کو بھانپنے کے بعد۔ علاجِ مرض کے بہت سے جتن کیے۔ پیرزادوں کو تعلیمی ترغیبات کے ساتھ ساتھ ہنرمندی کی طرف راغب کیا۔ مثال کے طور پر سنیے۔ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے حضرت قبلہ والدی و مرشدی (مولانا شاہ سلیمان پھلواروی) سے مسلسل مراسلت کی کہ ایک "مدرسۂ تعلیم تصوف" کھولنا چاہتا ہوں، اس کا نصاب کیا ہونا چاہیے؟ حضرت قبلہؒ نے انھیں ایک اعلیٰ نصاب لکھکر بھیجدیا۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت قبلہؒ سے یہ درخواست کی کہ اپنے چھوٹے صاحب زادے (مولانا شاہ محمد جعفر سلمہ اللہ تعالیٰ) کو یہ پورا انتظامِ تعلیم سنبھال لینے کے لیے دہلی آنے کی اجازت دیدیجیے۔ حضرت قبلہؒ نے ان کی فرمائش منظور فرمالی۔ اس اسکیم کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔ کیونکہ جعفر میاں خود ان ہی کی تحریک سے ریاستِ کپورتھلہ کی مرکزی مسجد کی خطابت کے لیے بلوا لیے گئے۔ کہنا

یہ ہے کہ یہ اسکیم اس لئے تیار ہوئی تھی کہ تمام پیرزادوں کو یہاں کھینچ کر دیگر علوم ضروریہ کے ساتھ تصوف کی بھی تعلیم دی جائے اور ہر ایک کو کوئی ایسا ہنر بھی سکھا دیا جائے جو اسے خودکفیل بنا دے۔ صوفیا کا درد اور تصوف کی لگن نہ ہوتی تو حضرت خواجہ صاحب کو اس دردسری کی کیا ضرورت تھی؟

اس سلسلے میں یہ حقیقت ناقابلِ فراموش ہے کہ پیرزادوں کو خودکفیلی کا سبق دینے کے لئے سب سے پہلے وہ خود کسب حلال کا مجسم عملی نمونہ بنے۔ بے علم و عمل مشائخ زادے یہ سمجھتے تھے اور اب تک بہت جگہ سمجھ رہے ہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا توکل ہے، صرف مزاروں کی آمدنی پر بسر کرنا رزقِ حلال ہے، کوئی محنت مزدوری کرنا صوفیت اور بزرگی یا پیرزادگی کی شان کے خلاف ہے۔ ان ہی غلط تصورات نے مشائخ زادوں کی زندگی میں زوال پیدا کیا تھا۔ اور یہ خواجہ صاحبؒ کا بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے مشائخوں کو کسبِ حلال کی نئی قدریں دیں، نئی کہاں؟ وہی تو اصلی قدیم اقدار ہیں خواجہ صاحبؒ کی یہ ادا دیکھئے اور دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھئے کہ انھوں نے کتابوں کا ٹوکرا سر پر اُٹھا کر دلی شہر میں کتابیں بیچیں، خود سینکڑوں کتابیں لکھ لکھ کر فروخت کیں، دوائیں بنا بنا کر ہی نہیں بلکہ ایجاد کرکے تجارت کی، محنت اور مزدوری کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام کیا ـــــ اور ہاں ساتھ ہی پیری مریدی کرکے سلسلۂ طریقت کو بھی چمکایا ـــــ مگر ہاں ایک کام نہیں کیا، کبھی نہیں کیا، زندگی بھر نہیں کیا، نہ وہ کر سکتے تھے، اور نہ کرنا چاہیئے تھا ـــــ وہ یہ کہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ فاقے کرلئے مگر سوال؟ سوال کرنے کا تو سوال ہی کیا، انھوں نے تو اپنے انتہائی دورِ آزمائش میں کبھی اپنی شکل و صورت بھی اس طرح کی سائلانہ بنائی کہ کوئی رحم کھا کر کچھ دیدے۔ اُن کے سامنے ایک ہی اعلیٰ قدر تھی، وہ یہ کہ گھٹیا سے گھٹیا مزدوری کرلینا بھی کوئی ذلت کی بات نہیں۔ بلکہ عین کسبِ حلال ہے۔

ذلت کا کام صرف ایک ہے اور وہ ہے سوال کرنا یا سوال کی صورت بنانا۔ اس انتظار میں بیٹھے رہنا کہ کوئی زائر آکر کچھ دیدے ———

اس خواجہ نے خواجگی کا حق ادا کر دیا کسی انسان پر بھروسا ہی نہیں کیا، اس نے اعتماد کیا خدائے رازق پر۔ اور خدا کے بخشے ہوئے ہاتھ پاؤں پر، اس کی دی ہوئی عقل وہمت پر۔ اپنی قوت بازو پر۔ ہمارے نزدیک اس دور میں تصوف اور مشائخوں کی اس سے بڑی اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس دور ہی میں کیا؟ ہمارے نزدیک تو آج بھی اور آئندہ بھی اس سے بڑی دوسری خدمت نہیں۔

بے علم وہنر پیرزادوں کی ان ہی غلط روشوں سے تصوف اور صوفیا بدنام ہو چلے تھے رخواص اور اونچے طبقوں کا تو ذکر ہی کیا۔ عوام بھی متنفر ہونے لگے تھے۔ مگر ہمارا یہ انوکھا خواجہ اس گرتی ہوئی دیوار کا پشتہ بن گیا۔ عوام تو عوام ہیں۔ انھوں نے تو چوٹی کے لوگوں کو بھی تصوف کی طرف مائل کیا۔ والیانِ ریاست کو مرید کیا۔ فرمانرواؤں کو جھکایا۔ لیڈروں، تاجروں، عالموں وزیروں اور رئیسوں کو متاثر کیا۔ ہندو سکھ عیسائی۔ انگریز اطالوی۔ امریکن۔ بدھسٹ۔ یوگی ہر طبقے کے اونچے سے اونچے اشخاص ان کے خلفا ہوئے۔ یا مرید۔ یا مائل بہ تصوف یا متاثر۔ اونچے طبقوں میں ہر صنف کے انسانوں کو اور بڑی بڑی شخصیتوں کو تصوف کی طرف مائل کرنا، خواجہ صاحب کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جو کم ہی کسی کو نصیب ہوا ہے اور عجیب کمال یہ ہے کہ وہ علم وادب کی راہ سے بھی آئے۔ تصنیف وتالیف کی راہ سے بھی آئے۔ تجارت کی راہ سے بھی آئے۔ دوا سازی کی راہ سے بھی آئے۔ تبلیغ کی راہ سے بھی آئے۔ مناظرے کی راہ سے بھی آئے۔ مقابلے کی راہ سے بھی آئے۔ صلح کی راہ سے اور جنگ کی راہ سے بھی آئے غرض ہر ہر راہ سے سامنے آئے۔ مگر ہر راہ میں تصوف اور صوفیا کی خدمت کا مشن ان کے جلو میں رہا۔ بڑے بڑے اونچے مقام پر آئے، مگر صوفیت کے ظاہری آداب

میں بھی فرق نہ آنے دیا۔ وہی ستر العرشی کلاہ۔ وہی لہراتی ہوئی زلفیں۔ وہی لمبا کرتا وہی فقیرانہ دوپٹہ۔ وہی انداز درویشانہ۔ وہی صوفیانہ آن، بان، شان گفتگو میں جادو قلم سحرِ مجسّم۔ اخلاق جاذب قلوب۔ آنکھوں میں کشش۔ دل میں شرافت وہمدردی۔ رائے میں اصابت۔ عزم میں پختگی۔ ارادوں میں استقامت — باہر سے کثرت اندر سے وحدت۔ مشاغل کی کثرتِ وتنوع کے باوجود، جذبہ صرف ایک — تصوف اور صوفیہ کی ہر امکانی خدمت اور پشت پناہی۔ یہ ہے تصوف کے خادم اور مشائخ زادوں کے محسن حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے اصل شن کا

خاکہ

مختصر اور بہت مختصر خاکہ

حضرت خواجہ حسن نظامی رح

کی تاریخ ہائے وصال

تواریخ سلطان ادب

۱۳۷۴ھ
وصال کی تواریخ —— ولیٔ کامل کا تاریخ نامہ
۱۳۷۴ھ —— ۱۳۷۴ھ

وہ ملقب بہ عمرک عمری ورما حلک رماحی
۱۳۷۴ھ
اے وا خسرو اقلیم خامہ مرد —— قطب الاقطاب خسرو خامۂ ادب
۱۹۵۵ء —— ۱۹۵۵

اب محبوب کے جانشین "اشرف الاقطاب" "شہنشاہِ دیں"
—— ۱۹۵۵ ——

(حضرت محبوب الٰہیؒ کے وصال کی تاریخیں "شہنشاہِ دیں" ۷۲۵ھ اور اشرف الاقطاب
ہیں۔)

عارفِ اعظم بود —— وصل آفتاب چشتیاں
۱۳۷۴ھ —— ۱۳۷۴ھ

ولی کامل انک علیٰ صراطِ مستقیم
۱۳۷۴ھ
آہ بجھا چراغ علم وادب —— زیستش پاک و روشن بود
۱۳۷۴ھ —— ۱۳۷۴ھ

مصور فطرت ادیب الملک اردو

۱۳۷۴ھ

اہل زباں غوث زماں قطب الاقطاب ــــ آفتاب اہل علم و یقیں

۱۹۵۵ء ــــ ۱۹۵۵ء

وہی اک پختہ کار تھے نہ رہے

۱۹۵۵ء

شمس العلماء آفتاب عرفاں ادیب ــــ آہ بجھا چراغ علم و ادب

۱۳۷۴ھ ــــ ۱۳۷۴ھ

وہ ہادی دین و دنیا خواجہ حسن نظامی دہلوی

۱۹۵۵ء

غوث وقت

۲۰۱۲ بکرمی

از پاک دل محمد حسین نظامی محرم شلہ

غفران ماب

۱۳۷۴ھ

از بھیا شیخ احسان الحق صاحب فقیر عشقی